وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ

تاریخ الامت

حصہ ہشتم

قرآن و تاریخ اسلام

مصنفہ

مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری
استاذ تاریخ اسلام - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

یک ہزار مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی قیمت عگر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ ۲۰۰۶

الحمد للہ وکفیٰ ۔ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ امّا بعد تاریخ الامت کو مکمل کئے ہوئے ایک مدّت گزر گئی ۔ اس درمیان میں بارہا یہ خواہش ہوئی کہ اس پوری تاریخ پر قرآنی زاویۂ نگاہ سے ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے تاکہ اُمّت کو معلوم ہو جائے کہ آج جن جن مصائب و آلام میں وہ گرفتار ہے وہ اس کی کن کن غلط کاریوں اور قرآن کی مخالفتوں کے نتائج ہیں لیکن یہ سوچ کر کہ مسلمان بالعموم قرآن سے دور ہو گئے ہیں ۔ نیز اپنے ماضی کو عظمت اور تاریخی شخصیتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں اور تنقید بہر صورت تلخ اور ناگوار شے ہے، قلم کو روک رکھا تھا ۔ مگر ساتھ ہی ضمیر کا یہ تقاضا بھی تھا کہ قرآن کو اللہ نے اسی لئے اُتارا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم چلیں اور اپنی غلطیوں کو جانچ کر ان کی اصلاح کریں، اس لئے اس کے طالب علم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے سے اپنی فہم کے مطابق صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرے اس وجہ سے بالآخر ایک فریضہ سمجھ کر اس کام کے لئے تیار ہونا ہی پڑا ۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو اُمّت کی تاریخ لکھنے کے لئے قلم اٹھائے ہوئے ہیں بالعموم دینی علوم میں لکیر کے فقیر اور قرآنی حقائق سے بےخبر ہیں ۔

علاوہ بریں یہ کوئی مذہبی بحث نہیں ہے جس سے کسی فریق کی تردید مقصود ہو بلکہ قرآن کی روشنی میں اپنے ماضی پر تنقید ہے جس میں جہانتک امکان میں تھا ہم نے حق و انصاف اور اپنی مسئولیت و ذمہ داری کو پیش نظر رکھا ہے اس لئے امید ہے کہ ارباب بصیرت بلاکسی تعصب کے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے۔

محمد اسلم جیراجپوری

جامعہ نگر۔ دہلی
۲ر جون ۱۹۴۴ء

تمہید

تاریخ الاُمت کے ساتوں حصّوں میں مسلمانوں کی مرکزی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہے، اور اس میں عہدِ رسالت سے ترکوں کے الغاءِ خلافت تک کے حالات آگئے ہیں۔ اس تاریخ کا عمود خلافت اسلامیہ ہے۔ یعنی سیرت کے بعد خلفاءِ راشدین، بنی اُمیّہ، عباسیہ بغداد، عباسیہ مصر، نیز فاطمیین اور خلفاءِ عثمانیہ۔ دیگر مسلمان خاندان جن کی سلطنتیں مختلف ملکوں اور اقلیموں میں قائم ہوئیں ان کے تذکرے ضمناً لکھے گئے ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ آسان عبارت میں مختصر طریقے سے ضروری تاریخی معلومات پیش کردی جائیں تاکہ اُمت کی پوری تاریخ اور اس کی عہد بعہد کی رفتار کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آجائے۔

اگرچہ ہر ہر دور کے خاتمے پر اس کی خصوصیات اور اس کے عروج و زوال کے اسباب سے بحث کی گئی ہے لیکن وہ تاریخی بحثیں ہیں جو مورخ کا فریضہ تھیں۔ قرآنی روشنی میں بہت کم اشارات کئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تکمیل تک بعض قرآنی حقائق مجھ پر اچھی طرح واضح ہی نہیں ہوئے تھے اور جو سمجھ میں آسکے تھے ان کے بیان کی جرأت میں اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ آج بھی میں یہ دعویٰ

نہیں کرتا کہ ان حقائق کا میں نے مکمل طور پر احاطہ کر لیا ہے بلکہ صرف اس لئے یہ تنقید لکھنے بیٹھا ہوں کہ قرآن کے طلبہ کے لئے آئندہ کے واسطے ایک راستہ نکالوں اور بس۔

اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ صدر اول یعنی صحابۂ کرام ہی کے زمانہ میں مسلمانوں میں سیاسی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے بعد دینی تفریق بھی شروع ہوئی جس کی وجہ سے مختلف سیاسی اور مذہبی فرقے بن گئے اور ہر فرقہ اپنے عقائد اور خیالات کو امت میں پھیلانے لگا۔ جب تاریخ کی تدوین ہونے لگی تو مورخوں نے رطب و یابس جس قدر روائتیں پائیں جمع کر لیں۔ اہل غرض نے ان کو دینی تقدس کا رنگ دے کر اپنے مقاصد میں بطور دلیل کے استعمال کرنا شروع کیا اس لئے ان تاریخوں کو عقیدتمندی کے ساتھ پڑھ لینا اور قرآن سے نہ جانچنا نہ صرف غیر مفید بلکہ بعض صورتوں میں مضر بھی ہے۔

تاریخ کا یہ عہد جو مسلمانوں کے خیالات اور عقائد پر اثر انداز ہوا صحابۂ کرام سے بنی عباس کے عروج ۲۳۲ھ تک ہے۔ انہیں عباسیہ کے زمانہ میں اس کی تدوین ہوئی جس پر مختلف قسم کے عوامل کارفرما رہے۔ میں جو کچھ لکھوں گا انہیں زمانوں کے متعلق لکھوں گا کیونکہ اس کے بعد سے امت کا مسلسل زوال شروع ہو گیا جس کی تاریخ کوئی مذہبی حیثیت نہیں رکھتی۔

اس کتاب میں جو آئتیں نقل کی گئی ہیں ان کا شمارہ اوپر دیا گیا ہے اور نیچے سورتوں کا اور کہیں کہیں صرف سورتوں کے نام لکھ دئے گئے ہیں۔

فہرست مضامین تاریخ الامت حصہ ششم

امت میں جو ابتدائی اختلافات واقع ہوئے ان کی اصلی بنیاد حکومت تھی نہ کہ دین۔ جماعتوں کی باہمی نزاعوں نے بڑھتے بڑھتے جنگوں اور خونریزیوں تک نوبت پہنچائی اور پھر ہر جماعت کے وہی سیاسی خیالات مختلف شکلوں میں ان کے دینی عقائد میں شامل ہوتے گئے جس کے باعث الگ الگ مذہبی فرقے بن گئے۔

لہذا مناسب یہ ہے کہ پہلے قرآن کریم سے اسلامی نظام حکومت کو بیان کردیں اس کے بعد ان سیاسی اختلافات سے بحث کریں تاکہ ان کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آسکے۔

اسلامی نظام

دین اسلام کی بنیاد وحدت اطاعت پر ہے یعنی سوائے اللہ کے کسی کی اطاعت نہیں۔ امت اسلامیہ کا انفرادی اور اجتماعی مقصود حیات صرف اللہ کی رضامندی ہے جو اسی کی اطاعت سے مل سکتا ہے لیکن اللہ خود اطاعت لینے کے لئے نہیں آتا بلکہ رسولوں کو بھیج کر ان کے ذریعے سے اطاعت لیتا ہے۔

وَمَا اَرسَلنَا مِن رَّسُولٍ اِلَّا لِیُطَاعَ باذن اللہ ۴/۶۴	اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ بحکم الٰہی اس کی اطاعت کی جائے

یہ رسول کی اطاعت عین اطاعت الٰہی ہے۔

وَمَن یُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۴؎	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

سارے قرآن میں سوائے اللہ کی اطاعت کے کسی دوسرے کی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ والدین کا بھی جہاں جہاں ذکر ہے ان کے ساتھ سلوک اور احسان ہی کی وصیت ہے اطاعت کا حکم نہیں ہے۔

الغرض دینی اطاعت صرف اللہ کی ہے جس نے اپنے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایات اور ان کی عقلوں کو صحیح راہ پر لگانے اور اپنی رضامندی و نارضامندی کے عملوں کو واضح کرنے کے لئے ایک ناقابل تغیر و تبدل کتاب قرآن کریم کو اُتار دیا ہے تاکہ اس کے مطابق عمل کر کے وہ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دُنیا جہان کی اطاعت سے بے نیاز ہو جائیں۔

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّ ھُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ ۱۱۴؎	کیا اللہ کے سوا میں اور کسی کو حاکم بناؤں حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتار دی ہے۔

دنیا میں جن لوگوں نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کی ہے وہ قیامت میں جب نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو جل کر کہیں گے:۔

رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۶۷؎	اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی سو انھوں نے ہم کو سیدھی راہ سے گمراہ کر ڈالا۔

رسالت ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ممتاز منصب تھے۔

۱۔ منصب پیغمبری ۔ یعنی پیغام الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس کے امتیازات یہ ہیں:۔

(۱) اس منصب کی رو سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ اور یہ اُمت ہمیشہ کے لئے آپ ہی کی اُمت ہوئی۔

(۲) یہ پیغمبری آپ کی ذات پرختم کردی گئی۔ اور اس کی تکمیل کے لئے آپ بھیجے ہی گئے تھے۔
(۳) اس حیثیت سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے لازم کردیا گیا تھا۔

یا ایہا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ ۵/۶۷	اے رسول! جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو پہنچا دے اور اگر تونے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

۲۔ **منصب امامت** ۔ یعنی احکام الٰہی کے مطابق لوگوں کو چلانا۔ ان کے باہمی تنازعات اور قضایا کے فیصلے کرنا۔ اجتماعی امور مثلاً جنگ وصلح وغیرہ میں ان کی قیادت اور نمائندگی وغیرہ۔ اس کے امتیازات یہ ہیں:۔
(۱) یہ امامت کبریٰ جو آپ نے بحکم الٰہی بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح وفلاح کے لئے قائم کی آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے سے قائم رہنی چاہیئے۔
(۲) آپ کے بعد آپ کے خلفاء یعنی جانشینوں کے وہی اختیارات ہوں گے جو اس لحاظ سے آپ کے تھے۔ اور ان کی اطاعت بعینہٖ اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی۔
(۳) اس حیثیت سے آپ لوگوں سے مشورہ لینے کے لئے مامور تھے۔

وشاورہم فی الامر ۳/۱۵۹	اور امر (حکومت) میں ان سے مشورہ لیا کرو۔

اللہ ورسول جیسا کہ مذکور ہوا قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے جملہ خلفاء داخل ہیں۔ اور ان خلفاء کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مرکزِ امت یعنی خلیفہ یا امام کے لئے یہی لفظ یعنی "اللہ ورسول" استعمال کیا ہے۔

یا اَیُّھا الَّذِینَ آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون ۲۰/۸	اے مومنو! اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔

اس آیت میں "عنہ" کی ضمیر مفرد ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ و رسول دونوں سے ایک ہی شے مراد ہے یعنی مرکز۔ ورنہ قاعدے کے مطابق "عنہما" ہونا چاہیے تھا۔ اور جبکہ تم سُن رہے ہو" کی قید سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہ ہے۔ اور عربی زبان میں اطاعت کہتے ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو

یا اَیُّھا الذین آمنوا استجیبوا للہ و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم ۲۴/۸	اے مومنو! اللہ و رسول کی بات مانو جب وہ تم کو ایسے کام کے لئے بلائے جس میں تمھاری زندگی ہو۔

یہاں بھی "دعا" کا صیغہ مفرد ہی اللہ و رسول دونوں کے لئے مستعمل ہوا ہے اور یہ حکم بھی حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے جو آپ کے تمام آنیوالے خلفاء پر مشتمل ہے۔

انما کان قول المؤمنین اذا دُعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا و اطعنا ۵۱/۲۴	مومنوں کا قول جب وہ اللہ و رسول کی طرف بلائے جائیں کہ انکے درمیان فیصلہ کرے بس یہی ہے کہ ہم نے سُنا اور مان لیا۔

اس میں بھی "لیحکم" جو دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے مفرد ہے۔ اسی طرح

قل اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حمل و علیکم ما حملتم و ان تطیعوہ تھتدوا ۵۴/۲۴	کہدے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اگر روگردانی کروگے تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے اور تمھاری ذمہ داری تمھارے اوپر ہے اور جو تم اس کی اطاعت کروگے تو ہدایت پر ہوگے۔

میں "علیہ" اور "تطیعوہ" دونوں میں ضمیر مفرد "اللہ و رسول" کی طرف راجع ہے۔

جنگ احد میں ہزیمت اٹھانے کے بعد دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ غنیم کے تعاقب میں نکلیں۔ یہ حکم چونکہ بحیثیت امام کے تھا اس لئے قرآن میں اللہ و رسول دونوں کا حکم کہا گیا

الذین استجابوا للہ و الرسول من بعد ما اصابھم القرح ۱۷۲/۳	جنھوں نے حکم مانا اللہ و رسول کا اپنے زخم اٹھانے کے بعد

اسی طرح حج اکبر کے دن مشرکوں سے برات کا اعلان جو مرکز اسلام کی طرف سے ہوا
اللہ و رسول کے نام سے ہوا ۔

واذانٌ من اللہ و رسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر انّ اللہ بریٌ من المشرکین و رسولہ ۹/۳	اور اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لوگوں کے لئے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ہے ۔

باغیوں اور ڈاکوؤں کو جو مرکز کے مجرم ہوں اللہ و رسول کا محارب قرار دیا گیا۔
انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا ۔ الایہ ۵/۳۳ | جو لوگ اللہ و رسول سے لڑیں اور روئے زمین میں فساد پھیلائیں ان کی سزا یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں۔
ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لئے ہے ۔ کچھ آنحضرتؐ کی زندگی ہی تک محدود نہ تھی۔
نہ صرف اُن آیتوں میں جن میں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے بلکہ بہت سی
دوسری آیتوں میں بھی اللہ و رسول سے مرکز ہی مقصود ہے ۔
خمس غنیمت کے بارے میں ہے ۔

اَنّما غنمتم من شئیٍ فانّ للہ خمسہٗ وللرسول ۸/۴۱	جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ و رسول کیلئے
مال فیئے کا بھی حکم یہی ہے	
ما افاء اللہ علی رسولہ من اہل القریٰ فللّٰہ وللرسول ۵۹/۷	بستی والوں سے جو کچھ اللہ اپنے رسول کو غنیمت دے وہ اللہ و رسول کے لئے ہے

ان اموال میں سے کبھی اللہ کا حصہ رسول سے جدا نہیں نکالا گیا۔ بلکہ اللہ و رسول سے
مرکز امت ہی سمجھا گیا ۔ اور یہ حکم رسول کے بعد بھی قائم رہا ۔
الغرض قرآن کی آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ "اللہ و رسول" کا
مفہوم امت کا مرکز یعنی خلیفہ یا امام وقت ہے ۔ اور یہ لفظ اس کے لئے اس وجہ سے
استعمال کیا گیا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے جب

تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ جن کا فریضہ یہ ہے کہ منصب امامت کو قائم رکھیں اور اُمّت کو قرآن کے مطابق چلائیں۔

اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے۔

یا أیُّھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ فان تنازعتم فی شیٍٔ فردوہ الی اللہ والرسول ۴/۵۹	اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو امراء ہوں ان کی اطاعت کرو۔ اگر کسی بات میں تم جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اصل مطاع اللہ ہے اس کی اجتماعی اطاعت ہوگی رسول (مرکز) یا اس کے مقرر کئے ہوئے اور اختیار دئیے ہوئے امراء کے ذریعے سے۔ ان امراء کا کوئی حکم یا فیصلہ اگر جمہور کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو اس میں ان کو امراء کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے۔ اس قسم کے نزاعی امور میں مرکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو ان کا فیصلہ کر دے گا۔

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا کانَ لمومنٍ ولا مومنۃٍ اذا قضی اللہ ورسولہ ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعصی اللہ	کسی مومن مرد یا عورت کو اپنے معاملے میں اختیار باقی نہیں رہتا جبکہ مرکز اس کا فیصلہ کر دے۔ اور جو

لہ مسلمانوں میں جب سے لامرکزیت آئی اُس وقت سے اُنھوں نے اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے قرآن و حدیث کو لے لیا اور اولوالامر کی جگہ علماء آگئے۔ جن کے باہمی جھگڑوں میں سے کوئی ایک جھگڑا بھی آج تک قرآن و حدیث سے فیصل نہ ہوسکا۔ یہ خیال مذہبی انفرادیت کی پیداوار ہے۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے جو ضروریات زمانہ کے مطابق امت کو قرآن کی روشنی میں اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔ اور اس کی ہر قسم کی باہمی نزاعوں کا فیصلہ کرتا رہے۔ نہ حدیث رسول ہے نہ علماء اولوالامر ہیں۔

ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا ۳۶/۳۳ | مرکز کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں جائیگا۔

یعنی مرکز ہی دینی اور دنیاوی امور میں آخری اور بالاترین اختیار ہے جس کی اطاعت کے سوا چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے۔

اقوال مفسرین

میں چونکہ قرآن کی تشریح کا خود قرآن ہی سے قائل ہوں اس لئے "اللہ و رسول" کا یہ مفہوم کہ اس سے مراد مرکز ہے یعنی امام وقت میں نے قرآن ہی کی چند آیات سے واضح کیا ہے جو اہل بصیرت کے لئے کافی ہیں اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو اور بھی متعدد آیات سے تفصیل پیش کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر عام اہل اسلام قرآنی الفاظ کی تفسیر میں گذشتہ مفسرین کے اقوال سے بھی سند چاہتے ہیں اور اور مدتہائے دراز سے اس کے خوگر ہو رہے ہیں۔ اس لئے ان کی تسکین خاطر کے واسطے چند ائمہ تفسیر کے اقوال بھی نقل کئے دیتا ہوں جنھوں نے "اللہ و رسول" کے معنی امام وقت ہی کے لکھے ہیں۔

امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت میں۔

قل الانفال للہ والرسول | کہدے کہ مال غنیمت اللہ و رسول کا ہے۔

انفال کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں:۔

"انفال کے معنی کے متعلق ان اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنھوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔"

یہاں انفال کے معنی سے مجھے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ "اللہ و رسول" کی تفسیر انھوں نے "امام" کی ہے۔

سورۂ بقرہ میں سود خواروں سے خطاب ہے کہ اگر تم باز نہ آؤ گے

فأذنوا بحرب من اللہ و رسولہ | تو سمجھ رکھو اللہ و رسول کی طرف سے جنگ

تفسیر جامع البیان میں ہے کہ امام کا فرض ہے کہ ان سے توبہ کرائے اور نہ مانیں تو

قتل کردے۔

امام رازی نے آیت "انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ۔الآیہ" کے تحت میں امام ابوحنیفہ کا قول نقل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ "اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ ان سزاؤں میں سے جو سزا چاہے اس کو دے"

نیز امام محی السنہ بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت ابن عباس۔سعید بن المسیب۔مجاہد۔عطاء۔حسن بصری۔ابراہیم نخعی۔ضحاک اور ابوثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی بحر و بر میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا۔پھر وہ گرفت میں آگیا اس کے متعلق امام کو اختیار ہے" (جو سزا چاہے دے)

ان اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں۔ایک تو یہ کہ "اللہ ورسول" سے امام وقت مراد ہے۔دوسری یہ کہ یہ احکام آنحضرتؐ کی ذات یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ ہمیشہ کے لئے ہیں۔اور یہی دونوں باتیں میں نے آیات سے واضح کی ہیں۔

آخر میں پھر تصریح کر دیتا ہوں کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مرکز کو "اللہ ورسول" کہتا ہوں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز ہی کی اطاعت کو قرآن اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیتا ہے بشرطیکہ مرکز قرآن کے مطابق ہو۔

دستور العمل قرآن جس طرح امت اسلامیہ کی انفرادی زندگی کے لئے اتارا گیا ہے اسی طرح اس کی اجتماعی زندگی کا بھی دستور العمل وہی ہے۔وہ ایسی کامل کتاب ہے کہ ہر زمان و مکان اور ہر ماحول میں افراد کی ہدایت اور ملت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔اسی لئے جہاں ہر مسلمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرآن کی پیروی کرے وہاں مرکز کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ اسی کے مطابق حکمرانی کرے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے کہ جو

بما اراک اللہ	۱۰۵ / ۴	کچھ اللہ تجکو سمجھائے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کر۔

قرآن کے سوا کسی دوسرے قانون کی طرف رُخ کرنے کی ممانعت کی گئی۔

فاحکم بینہم بما انزل اللہ ولا تتبع اہوائہم عما جاءک من الحق	۴۸ / ۵	ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس حق کو جو تیرے پاس آیا ہے چھوڑ کر ان کے خیالات کے پیچھے نہ چل

شدید تاکید کی گئی کہ مرکز کو قرآنی تعلیمات سے ذرا بھی غفلت یا کوتاہی روا نہیں ہے

اور نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اس پر کاربند رہنا چاہیئے۔

فاحکم بینہم بما انزل اللہ ولا تتبع اہوائہم واحذرہم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک	۴۹ / ۵	ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی باتوں کے پیچھے نہ جا۔ اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے ہٹا کر وہ تجکو فتنے میں نہ ڈالدیں۔

یہاں تک کہ یہ وعید بھی کی گئی۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الفاسقون	اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکومت نہ کریں گے وہ فاسق ہیں۔

امام کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا قرآن کی تعلیم "وامرہم شوریٰ بینہم" کے مطابق لازم ہے اور قرآن کے حکم "وشاورہم فی الامر" (ان سے حکومت میں رائے لیا کرو) کے مطابق امام مامور ہے کہ اہل شوریٰ کے مشورے سے کام کرے۔

امام اور مشیروں کی یہی جماعت اُمت کی مرکزی جماعت ہے جس کا اصولی قانون صرف کتاب اللہ ہے۔ اسی کی روشنی میں ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق قوانین بنائے جائیں گے۔ اسی کا نام حکومت الٰہی ہے جس کا مقصد اقامت حق اور اعلائے کلمۃ اللہ

ہے۔ تاکہ ہر انسان صحیح طور پر اکیلے اللہ کا بندہ اور خلیفہ فی الارض ہو سکے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔

فریضۂ امّت ۔ اسلام کے معنے ہی اطاعت کے ہیں۔

اِنَّ الدِّین عند اللہ الاسلام ۱۷/۳ | حقیقی دین اللہ کے نزدیک اطاعت ہے

مسلمانوں کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ و رسولؐ یعنی مرکز کے مطیع رہیں۔

واطیعوا اللہ ورسولہ ان کنتم مومنین ۱/۸ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ و رسول کی اطاعت کرو

مرکز کے وفادار رہو۔ اور اس سے غدّاری اور مفوضہ فریضہ میں خیانت کاری نہ کرو۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون ۸/۵ | اے مومنو! مرکز سے غدّاری اور جان بوجھ کر اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو۔

مرکز کے احکام سے سرتابی کرنے والے سب سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

اِنَّ الَّذین یُحادّون اللہ ورسولہٗ اولٰئک فی الاذلین ۲۰/۵۸ | جو لوگ مرکز سے مخالفت کرینگے وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک صرف اللہ ہی حاکم ہے اور جن و انس کا فریضہ اسی کی اطاعت ہے۔ یہی نقطہ امن عالم کا مرکز ہے جس سے اقوام و اُمم کے باہمی جھگڑے اور مناقشے ختم ہو سکتے ہیں اور سب کے سب وحدتِ اطاعت کی بدولت متحد ہو سکتے ہیں۔

چونکہ یہ مرکز عقلی ہے اس واسطے اس کے لئے محسوس مظہر کی ضرورت تھی جو منصب امامت سے پورا کیا گیا ہے۔ رسولؐ اور اس کے بعد خلفا، حکومت الٰہی کے نمائندے ہیں جو امت سے یہ اطاعت لیں گے اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے اصول اور احکام کے مطابق اس کو چلائیں گے۔ یہی حکومت الٰہیہ ہے۔ یہی اُمّت اسلامیہ کی سیاست ہے اور یہی اس کا اجتماعی دین ہے۔

حکومت ۔ قرآن سوائے حکومت الٰہی کے بقیہ جملہ اقسام کی حکومتوں کو "طاغوت"[۱]

---

[۱] حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

قرار دیتا ہے۔ بادشاہت جس کا تسلط خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں پر ہوا، اکثر حالتوں میں دنیا کے لئے ایک مصیبت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ اور اس کے ارکانِ حکومت وزراء، امراء، عمّال اور فوج مل کر اپنی قوت سے پورے ملک کے باشندوں کو تاج کا غلام بنا لیتے ہیں اور ان کی محنت کو اس کے اور اس کے تحت میں اپنے فائدوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آج کل جمہوریت اور آمریت دو قسم کی حکومتیں دنیا میں زیادہ نمایاں اور باہم دگر برسرپیکار ہیں لیکن اسلام مروجہ اصطلاحی معنوں میں نہ جمہوریت کو صحیح قرار دیتا ہے نہ آمریت کو۔ کیونکہ جمہوریت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق حکومت جمہور کو حاصل ہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں۔ اس حق سے وہ نمائندے حکومت اور وضع قوانین کے مجاز ہو جاتے ہیں اور آمریت میں مختار ناطق کی ذات میں حکومت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے مگر اسلام جس کی بنیاد وحدت اطاعت پر ہے کسی انسان یا کسی انسانی جماعت میں حکومت کا حق نہیں مانتا۔ بلکہ اس کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔

اِنِ الحُکمُ اِلّا للّٰہ امر ان لا تعبدوا الّا ایاہ ۱۲/۴۰	کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کی فرمانبرداری نہ کرو۔

وہی بلا شرکت غیرے حاکم اور مطاع ہے

ولا یشرک فی حکمہ احدًا ۱۸/۲۵	اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو ساجھی نہیں بناتا

انبیاء کرام تک کو بھی جو بنی نوع انسان کا سب سے بلند طبقہ ہے یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ کسی کو اپنا محکوم بنائیں۔ بلکہ صرف یہ کہ ان کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق چلائیں۔

لہ یہ لفظ طغیان سے نکلا ہے جس کے معنی سرکشی اور حد سے آگے بڑھنے کے ہیں۔ طاغوت ہر وہ شخص ہے جو اپنا تسلط جمالے۔ خواہ مادی تسلط ہو جیسے بادشاہوں کا خواہ روحانی جیسے دیوتاؤں اور غلط پیشواؤں اور رہنماؤں کا۔

ماکان لبشرٍ ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون

کسی شخص کو جسے اللہ کتاب، اور حکم اور نبوت[۱] دے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے محکوم بنو۔ بلکہ (اس کو یہی کہنا فرض ہے) کہ تم اللہ والے بنو اس کے مطابق جو تم کتاب کو پڑھتے پڑھاتے ہو

اس لئے ملت اسلامیہ کی مرکزی جماعت خود حکمراں نہیں ہے بلکہ صرف قوانین الٰہی کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔ وہ ہنگامی ضروریات کے لئے جو فروعی ضوابط تیار کرے گی اس میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکے گی جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الظالمون

جو اللہ کے اتارے ہوئے (اصول) کے مطابق حکومت نہ کرے وہ ظالم ہے۔

قرآن سے نصیحت ہر مسلمان لے سکتا ہے کیونکہ وہ افراد کی بھی مکمل اصلاح کے لئے ہے تاکہ وہ ملت کا جزو صالح بن سکیں لیکن اس کو اجتماعی طور پر عمل میں لانے کے لئے اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اصول سے زمانے کے مقتضیات کے مطابق فروع کے اخذ کرنے کا حق صرف مرکزی جماعت ہی کو حاصل ہے۔ اسی طرح کوئی تعلیم یا تلقین یا امت کی کوئی ارشاد یا رہنمائی بلا اجازت مرکز کے نہیں ہو سکے گی نیز مرکز کا یہ بھی فریضہ ہوگا کہ امت کے افراد۔ طبقات اور جمہور و حکام کے تنازعات کو مٹاتا رہے اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف و افتراق نہ پیدا ہونے دے۔ اس نظام میں ارباب علم و عقل کو فکر کی پوری حریت اور اجتہاد کی مکمل آزادی کے علاوہ قرآن نے درجات عالیہ کی سربلندی بھی عطا

---

[۱] اس آیت کا پہلا حصہ تفصیل طلب ہے۔ یہاں مختصراً اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ واو عاطفہ کی وجہ سے تقدیر کلام یوں ہے کسی شخص کو جسے اللہ کتاب کا حامل بنائے اور کسی شخص کو جسے اللہ حق و باطل کی تمیز عطا فرمائے اور کسی شخص کو جسے اللہ نبوت بخشے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔ یعنی ایسی کوئی حکومت جس کا مقصد انسان کی اطاعت ہو قرآن کی رو سے جائز نہیں ہے۔

فرمائی ہے لیکن ان کو مطاع نہیں قرار دیا ہے اطاعت اکیلے اللہ ہی کی ہے۔ ان کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج امت کے لئے اسی وقت دینی یا آئینی ہوں گے جب مرکز سے مسلم ہوکر اس کو ملیں گے۔

قرآن کی ان تعلیمات سے جو نہایت اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہیں حسب ذیل امور واضح ہو جاتے ہیں۔

(۱) اسلام کی بنیاد اکیلے اللہ کی اطاعت پر ہے۔

(۲) امت سے یہ اطاعت رسول خود یا اپنے مقرر کئے ہوئے امراء کے ذریعے سے لے گا۔

(۳) رسول نام نہیں ہے بلکہ منصب ہے جس کو امامت کے لحاظ سے بذریعہ خلفاء کے ہمیشہ قائم رہنا چاہئے۔

(۴) امام کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا لازم ہے یہی جماعت معہ امام کے ملت کا مرکز ہے۔

(۵) اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

(۶) مرکز کے اختیارات ملت پر ہمیشہ وہی رہیں گے جو بحیثیت امام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے۔ اس کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس کا فیصلہ ہر امر میں آخری اور قطعی ہے جس سے کسی کو سرتابی کا اختیار نہیں ہے۔

(۷) علماء و بزرگان دین خواہ کسی درجہ کے ہوں مطاع نہیں ہیں بجز اس حد کے جس حد تک مرکز کی طرف سے ان میں سے کسی کو اختیار دیا گیا ہو۔ قرآن نے اکیلے اللہ کی اطاعت کا حکم دے کر احبار و رہبان پرستی اور پاپائیت و برہمنیت کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا ہے۔

(۸) حکومت کا حق اسلام میں سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہے۔ مرکز کا فریضہ صرف

حکومت الٰہی کو چلانا ہے۔

(۹) اس حکومت الٰہی کا اصولی دستورالعمل اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب یعنی قرآن کریم ہے۔

(۱۰) قرآن سے نصیحت ہر شخص لے سکتا ہے لیکن اس کے اصول سے ہر زمانے میں ضوابط کی تفریع جو امت کے لئے مستند آئین ہو صرف مرکزی جماعت ہی کی طرف سے ہوگی۔

عہدِ رسالت

حقیقی دین آغازِ آفرینش سے ایک ہی ہے یعنی اکیلے اللہ کی بندگی۔ انسانوں کی تخلیق اسی لئے ہوئی ہے کہ اکیلے اللہ کے بندے بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۵۶/۵۱ | اور میں نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر اسی لئے کہ میری فرمانبرداری کریں۔

اسی اطاعت الٰہی کا نام دین اسلام ہے اور قرآن نے اسی کو فطرتی دین قرار دیا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْہَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۳۰/۳۰ | تو ایک طرف کا ہو کر اپنا رُخ اصلی دین کی طرف کر یہ اس فطرت کے مطابق ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے

دوسری جگہ اسی مطلب کو یوں ادا کیا ہے۔

واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظہورہم ذریتہم واشہدہم علی انفسہم الست بربکم قالو بلٰی شہدنا ۱۷۲/۷ | (روزِ ازل) جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور خود انھیں کو ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے

کہا کہ ہاں بیشک ہم اس پر گواہ ہیں۔

خود ان کو ان کے اوپر گواہ بنانے کے معنے یہ ہیں کہ یہ بات ان کی سرشت میں رکھ دی گئی جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی کیونکہ فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں۔

رسالت کا فریضہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ انسانوں کی اسی صحیح فطرت کو بیدار کرے اور بھولی ہوئی شہادت ان کو یاد دلائے۔ اولین رسل حضرت نوح یہی پیغام لے کر آئے تھے۔

یا قوم انی لکم نذیر مبین ان اعبدوا اللہ واتقوہ $\frac{2}{71}$	اے میری قوم میں تمہارے لئے کھلا ہوا نذیر ہوں کہ تم اللہ کی فرمانبرداری کرو اور اس سے ڈرو۔

اور آخر میں رسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی یہی تعلیم رہی۔

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحًا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراہیم وموسٰی وعیسٰی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ $\frac{13}{42}$	تمہارے لئے اس نے دین کا راستہ وہی بنایا جس کی نوح کو وصیت کی تھی اور جس کو ہم نے تجھ پر وحی کیا اور جس کی ہم نے ابراہیم اور موسٰی اور عیسٰی کو وصیت کی تھی کہ دین کو قایم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

ہر امت کے رسول یہی پیغام لے کر آئے

ولقد بعثنا فی کل امۃٍ رسولًا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت $\frac{36}{16}$	اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجے کہ اللہ کی فرمانبرداری کرو اور زبردستوں سے کنارہ کشی۔

کُل رسولوں کی تعلیم ایک اور امت بھی ایک ہی ہے

یا ایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا انّی بما تعملون علیم ان ہذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون $\frac{52}{23}$	اے رسولو! پاک روزی کھاؤ اور نیک عمل کرو تم جو کچھ کرتے ہو میں جانتا ہوں۔ یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار رہوں۔ سو میری فرمانبرداری کرو۔

الغرض دین اسلام یہی ہے کہ اکیلے اللہ ہی کی فرماں برداری ہو۔ اس کے سوا کوئی

آقا ہے نہ کوئی رب۔ نہ انسان کسی غیر کا بندہ ہے۔

رسالت اور نبوت سلسلہ وار اپنا یہی فرض ادا کرتی چلی آئی لیکن خاتم النبیین سے پہلے جس قدر نبی یا رسول آئے وہ اپنی اپنی ایک ایک محدود جماعت کی اصلاح کے لئے تھے۔ یعنی قومی یا قبائلی نبی تھے۔ اور جہاں تک تاریخ شہادت دیتی ہے ان کے اُٹھ جانے کے بعد ان کا روشن کیا ہوا چراغ ہدایت بھی ماند پڑجاتا یا بجھ جاتا تھا یہی حال آسمانی کتابوں کا تھا کہ خود ان کے پیرو ان میں تغیر وتبدل اور تحریف کرکے کچھ کا کچھ بنا لیتے تھے۔

خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے سلسلۂ نبوت ختم کرنے کے لئے اپنا سب سے آخری نبی بنایا، اور کسی قوم یا قبیلے کی طرف نہیں بلکہ ساری دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعًا ۱۵۸/۷	کہدے کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں
وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا ۲۸/۳۴	اور ہم نے تجکو نہیں بھیجا مگر سارے انسانوں کے لئے بشیر ونذیر بنا کر

دوسرے لفظوں میں آپ کا فریضہ یہ ہوا کہ جملہ نوع بشر کو اکیلے اللہ کی فرماں برداری میں لاکر ایک ہی آقا کا بندہ اور باہم بھائی بنانے کی کوشش کریں۔ آپ کے بعد اس فریضہ کی تکمیل آپ کی اُمت کے ذمہ کی گئی کیونکہ اب کوئی نیا نبی آنے والا نہ تھا سورۂ حج کی آخری آیت میں ہے۔

وجاہدوا فی اللہ حق جہادہ ہو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراہیم ہو سماکم المسلمین من قبل وفی ہذا لیکون الرسول شہیدًا علیکم وتکونوا شہداء علی الناس	اللہ کی راہ میں کوشش کا جو حق ہے بجا لاؤ۔ اس نے دین میں تمھارے اوپر کوئی تنگی نہیں کی ہے (یہ دین) تمھارے باپ ابراہیم کا ہے۔ اللہ نے تمھارا نام مسلمان رکھا پہلے سے بھی اور اس کتاب میں بھی تاکہ رسول تمھارے اوپر تبلیغ کرے اور تم لوگوں پر تبلیغ کرو۔

اسی لئے آپ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی اس کو بمقابلہ دیگر آسمانی کتابوں کے وہ خصوصیات عطا کی گئیں تاکہ دنیا میں اللہ کی اتاری ہوئی مکمل تعلیم اس امت کے ہاتھ میں موجود رہے۔

(۱) جملہ سابقہ آسمانی کتابوں کی حقیقی اور جاودانی تعلیمات اس میں محفوظ کی گئیں اور یہ ان سب کی محافظ اور مہیمن قرار دی گئی۔

(۲) خود اس کتاب کی حفاظت ہمیشہ کے لئے اللہ نے اپنے ذمہ لی۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۹/۱۵ | ہم نے ہی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں

اس کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کا وعدہ ہے

اتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلمٰتہ ۲۷/۱۸ | تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدلنے والا نہیں

خاتم النبیین کا درجہ جتنا بلند رکھا گیا اتنا ہی عظیم الشان فریضہ بھی ان کے ذمہ لگایا گیا۔ پھر مشیت الٰہی نے ان کی بعثت کے لئے وہ قوم چنی جو عقیدہ و عمل میں سراسر مشرک قبائلی زندگی کی سخت خوگر۔ اور آبائی رسوم پر جان دینے میں نہایت بے باک تھی۔

عرب جاہلیت

اسلام سے قبل عربی قوم سادہ طبیعی زندگی رکھتی تھی اور اپنے خاندانی رسوم و روایات کے سوا کچھ جانتی نہ تھی، صنائع سے نفور، اور علوم سے دور۔ اطراف عرب یعنی شامی سرحد کے غسانی قبائل، عراق کے اہل حیرہ اور یمن کے شہری باشندوں کو چھوڑ کر جن پر رومی اور ایرانی تہذیب کا سایہ پڑا تھا بقیہ ملک میں کہیں کہیں یہودی یا عیسائی ثقافت کے سوا تمام تر جہالت اور وحشت غالب تھی۔ نہ عرب میں کوئی مدرسہ تھا، نہ عربی میں کوئی کتاب تھی، نہ عربوں میں کوئی تعلیم یافتہ تھا۔ بلاذری نے مکہ کے صرف سترہ آدمیوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے اپنی تجارتی ضرورت سے معمولی نوشت و خواند حیرہ والوں سے سیکھی تھی۔ اور مدینہ کے

کل گیارہ آدمی۔

اندرون ملک میں بارش اور پیداوار کی کمی اور دائمی خشک سالی کی وجہ سے بادیہ نشینوں کا ذریعۂ معاش زیادہ تر لوٹ مار تھا۔ قبائل رات دن ایک دوسرے پر حملے کرتے تھے اور غارت گری ان کا پیشہ ہو گیا تھا جس میں کسی حد پر وہ رُکنے والے نہ تھے بقول ابن خلدون وہ دوسروں کا محل صرف اس مقصد کے لئے بھی گرانے میں دریغ نہ کرتے تھے کہ اس کی بنیاد کے پتھروں سے چولھا بنائیں گے اور دیوار کی کھونٹیوں سے خیموں کی طنابیں کسیں گے۔ اس طرح ان میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم تھا جس نے ان کو فنا کے قریب پہنچا دیا تھا۔

دینی لحاظ سے وہ اگرچہ اللہ کو مانتے تھے مگر مشرک اور بُت پرست تھے اور شرک تمام قبائل میں شائع تھا۔ ہر مقام اور ہر قبیلہ میں الگ الگ بت مخصوص روایات کے مطابق نصب تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی لیکن ان کے ساتھ عقیدت رسمی تھی۔ کیونکہ جاہل عربوں کی نگاہوں میں زیادہ تر مادی منفعت اور مادی زندگی تھی اور یہی ان کی ساری جدوجہد کا محور تھی۔

تند مزاجی اور غضبناکی ان کی عام صفت تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ بیٹھتے تھے اور حریت کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ سوائے اپنے رئیس یا دینی اطاعت کے اور کسی کی فرمانبرداری کو ننگ و عار سمجھتے تھے لیکن یہ جذبہ بھی اجتماعی نہ تھا بلکہ شخصی یا قبائلی تھا۔ اپنی یا اپنے قبیلے کی ہتک حرمت کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے اور فوراً تلوار لے کر فیصلہ کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

الغرض عہد جاہلیت کی تہذیب، اگر اس کو تہذیب کہا جا سکے جہالت، سفاکی اور غارت گری تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ان مسلسل جنگوں نے ان میں شجاعت، جفاکشی اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی جس سے مشکلات میں اپنی ذات اور اپنی تلوار پر بھروسہ رکھتے

مقابل کی تعداد اور قوت کا لحاظ کئے بغیر خطرے میں کود پڑتے اور جان کی پروا نہیں کرتے تھے ۔ وہ اپنی ہمسایہ قوموں یعنی رومیوں اور ایرانیوں کی طرح سایہ پرورده اور تہذیب زده نہیں تھے ۔

طبعًا ان میں سخاوت اور مہمان نوازی تھی اور وفاء عہد کو لازم سمجھتے تھے ۔ اسی کے ساتھ گویائی اور قوت بیان میں ممتاز تھے ۔ نیز ان کی حق گوئی ۔ حق پسندی اور حق کی قبولیت کی استعداد ان کے سخت سے سخت نکتہ چینیوں کو بھی تسلیم کرنی پڑی ہے اور غالبًا یہی صلاحیتیں تھیں جن کی بدولت قدرت نے انھیں اُمیوں کو خاتم النبیین کی بعثت اور ان کے بعد اسلام کا اولین مبلغ ہونے کے لئے منتخب کیا ۔

آخر کار انھیں کے گریبان سے انسانیت کا سب سے بڑا اور روشن آفتاب طلوع ہوا یعنی عرب کے مرکز مکہ مکرمہ میں ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل سنہ ۵۷۱ء میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی ۔

بعثت

۲۵ رمضان کو جیسا کہ بعض مورخوں کی تحقیق ہے غار حرا میں آنحضرتؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی ۔ یہ تاریخ مطابق تھی ۶ اگست سنہ ۶۱۰ء کے ۔ اس وقت حضور اکرم کی عمر چالیس سال چھ مہینے سولہ دن کی تھی اور شمسی حساب سے ۳۹ سال ۳ ماہ اور ۱۶ دن کی ۔ یہی تاریخ جاہلیت اور اسلام کی حد فاصل ہے کیونکہ اسی دن خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہوگیا ۔ جو لوگ زیادہ قرب اور خصوصیت رکھتے تھے ان میں سے چار افراد اسی دن ایمان لائے ۔ عورتوں میں سے حضرت خدیجہ مردوں میں سے حضرت ابوبکرؓ لڑکوں میں سے حضرت علیؓ جن کی عمر اس وقت دس سال تھی، اور غلاموں میں سے حضرت زید بن حارثہؓ جو آپ کے متبنّٰی کہے جاتے تھے ۔

تین سال تک اسلام کی تبلیغ مخفی ہوتی رہی ۔ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ اپنے واقف کاروں میں سے جن میں حق پسندی دیکھتے ان کو اسلام کی دعوت کرتے ۔ اس عرصہ

میں کچھ لوگوں نے اس دین کو قبول کر لیا جنھوں نے بعد میں بڑے بڑے کارنامے چھوڑے ہیں۔ اس کے بعد جب بحکم الٰہی

فاصدع بما تومر و اعرض عن المشرکین ۹۴/۱۵ | تم کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکوں کی پروا نہ کرو۔

دعوت اسلام کا اعلان ہوا اور مشرکوں کی مذمت کی گئی تو کفار قریش نے مخالفت شروع کی۔

کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ ۱۳/۴۲ | گراں ہے مشرکوں پر وہ بات جس کی طرف تو ان کو بلاتا ہے

اُنھوں نے پہلے سمجھایا، پھر لالچ دلائی، پھر دھمکیاں دیں، بالآخر مقابلے پر اتر آتے رسول اللہ پر آوازے کستے۔ بے حرمتی کرتے جو لوگ مسلمان ہو جاتے ان کے کنبہ والے ان کو ستاتے اور جو غلام اسلام قبول کر لیتا اس پر اس کا آقا سختیاں کرتا جن کی وجہ سے بعض کی جانیں بھی تلف ہو گئیں۔

پانچ سال تک ان تلخیوں اور تکلیفوں کو سہتے سہتے مجبوراً رسول اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مکہ چھوڑ کر حبشہ کے ملک میں چلے جائیں، چنانچہ رفتہ رفتہ ۸۳ مرد اور ۱۷ عورتیں مکہ سے حبشہ چلے گئے۔

بنی ہاشم اور خاص کر ابوطالب جو آنحضرت کے چچا تھے اور خاندانی لحاظ سے آپ کی حمایت کرتے تھے۔ کافروں نے ان سے بھی ہر قسم کے تعلقات توڑ لئے اور اسلام کی تبلیغ اور اس کی طرف لوگوں کے آتے میں جہاں تک ہو سکا رکاوٹ ڈالنی شروع کی۔

بعثت کے دسویں سال ابوطالب انتقال کر گئے، ان کے بعد ہی ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے بھی جو آپ کی مشیر اور مددگار تھیں وفات پائی۔ اب دشمنوں کو دست درازی کا موقع ملا اور آنحضرتؐ کو زیادہ ستانے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک کافر نے خاک اٹھا کر آپ کے سر پر ڈال دی۔

اس لئے آنحضرتؐ کو اہل مکہ کے اسلام سے مایوسی ہوگئی اور اس تلاش میں ہوئے کہ کوئی ایسا قبیلہ ملے جو اسلام کی حمایت کے لئے تیار ہو جائے تو میں اس کے ساتھ مل کر تبلیغ رسالت کے فرائض ادا کروں۔ اس امید پر آس پاس کے مختلف مقامات میں تشریف لے گئے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

حج کے زمانے میں جو قبائل آتے ان میں بھی جاکر تبلیغ کرتے لیکن قریش کی مخالفت کی وجہ سے وہ بھی آپ کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ اتفاقاً مدینے کے بھی کچھ لوگ مکہ میں آئے، انھوں نے آپ کی باتیں سنیں، ان کے دلوں میں اسلام کی حقانیت بیٹھ گئی۔ واپس جاکر انھوں نے مدینے میں آپ کا چرچا کیا۔ دوسرے سال حج کے موقع پر وہاں کے بارہ آدمی آکر مسلمان ہوئے۔ آنحضرتؐ نے مصعب بن عمیرؓ کو جو سابقین اولین میں سے تھے ان کے ساتھ کر دیا کہ قرآن پڑھائیں اور مدینے میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اہل مدینہ پر اس تبلیغ کا ایسا اثر ہوا کہ گھر کے گھر مسلمان ہونے لگے۔

نبوت کے تیرھویں سال وہاں کے ۷۵ مسلمان حج کے موسم میں مکہ میں آئے۔ اور رات کے وقت چھپ کر مقام عقبہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ مدینے میں تشریف لے چلیں ہم جان و مال سے حمایت کے لئے تیار ہیں۔ اس بیعت کے بعد مکہ میں جو لوگ اسلام لاتے آنحضرتؐ ان کو مدینے بھیج دیتے بعد میں حبشہ کے مہاجرین بھی مدینے میں آگئے۔

ہجرت

کفار مکہ نے یہ دیکھ کر کہ آنحضرتؐ کی جماعت مدینے میں بڑھ رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی ان میں جا ملیں اور اپنی طاقت بڑھا کر ہم سے جنگ کریں مشورہ کیا کہ قتل کر ڈالیں۔ اب اللہ نے آپ کو مکہ چھوڑ دینے کی اجازت دی۔ رات کے وقت حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر نکلے اور جبل ثور کے ایک غار میں چھپ رہے۔ تیسرے دن جب کفار کی تلاش و جستجو کم ہوگئی اس میں سے نکل کر مدینے کو روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے آس پاس کے یہودی قبائل سے جو دولت مند اور طاقت ور تھے عہد نامے کئے۔

منجملہ شرائط کے یہ شرط بھی تھی کہ دشمنوں کے مقابلے میں ہر ایک دوسرے کی مدد کرے گا اور یہود قریش یا ان کے حلیفوں کو پناہ نہ دیں گے۔

یہیں سے اسلام کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور قرآن نے مخالفوں سے مدافعانہ جنگ کی اجازت عطا فرمائی۔

اُذِنَ للذین یقاتلون بانہم ظلموا ۲۲ | ۳۹ | جن سے لوگ لڑتے ہیں ان کو (بھی لڑنے کی) اجازت دی گئی اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا۔

مدنی زندگی مکہ سے نکل آنے کے بعد قریش کی دشمنی بڑھ گئی۔ انھوں نے نہ صرف ہجرت کر جانے والے مسلمانوں کی ملکیتوں پر قبضہ کر لیا بلکہ رؤسار مدینہ خاص کر عبداللہ بن اُبی کو جو بہت بڑا سردار تھا ان کے برخلاف اکسانا شروع کیا۔ نیز مدینہ کے آس پاس کے قبائل میں بھی ریشہ دوانیاں کرنے لگے جس سے مسلمانوں کو ہر وقت خطرہ رہنے لگا۔ آنحضرتؐ خود راتوں کو جاگتے اور جوانوں کو پہرہ دینے کے لئے مقرر کرتے۔

قریش کا ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ ہر سال گرمیوں میں ان کا کاروانِ تجارت ملک شام کو جاتا تھا جس کے راستے میں مدینہ تھا۔ مسلمانوں نے یہ سوچا کہ ان کی اس تجارت کو روک دیا جائے تاکہ وہ عاجز آکر امن و آشتی کا رویہ اختیار کریں۔ اس لئے جب قریش کے آنے یا جانے کا پتہ ملتا تو کبھی خود آنحضرتؐ مع صحابہ کے ان کو روکنے کے لئے جاتے اور کبھی کسی کے ساتھ کچھ آدمیوں کو بھیج دیتے۔ مورخوں نے یہ اصطلاح رکھی ہے کہ جس یورش یا لڑائی میں آنحضرتؐ خود شریک ہوئے اس کو غزوہ اور باقی کو سریہ کہتے ہیں۔ انھیں سرایا میں سے عبداللہ بن جحش کا سریہ تھا جن کو رجب ۲ھ میں آٹھ مہاجروں کے ساتھ روانہ کیا کہ مکہ کے قریب پہنچ کر قریش کے ارادے معلوم کریں۔ یہ لوگ بطن نخلہ میں تھے کہ وہاں سے عمرو بن حضرمی جو قریش کا حلیف تھا معہ اپنے تین تجارتی اونٹوں کے گزرا۔ ایک مہاجر نے اس کو تیر مارا جس سے وہ مر گیا۔ اس کے قتل سے قریش کی عداوت کی آگ اور بھڑک اٹھی

آئندہ لڑائیوں کا سلسلہ اسی سے شروع ہوا۔ چنانچہ اس واقعہ کو ۲ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ بدر کی جنگ پیش آگئی۔ ابوسفیان شام سے تجارتی قافلہ لا رہے تھے جب پتہ پایا کہ مسلمان اس پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں تو ایک تیز رو قاصد مکہ کی طرف دوڑایا۔ قریش خبر پاتے ہی اپنے اموال کی حفاظت کے لئے روانہ ہوگئے۔ ابوسفیان راستہ بدل کر ساحل بحر سے قافلے کو نکال لے گئے اور مکہ والوں کو کہلا بھیجا کہ واپس چلو۔ لیکن قریش کے سرداروں خاص کر ابوجہل نے واپسی سے انکار کیا اور کہا کہ ہم بدر میں جاکر ٹھہریں گے اور تین دن جشن منائیں گے تاکہ قبائل میں ہمارے آنے کی شہرت اور ہمارا رعب غالب ہوجائے۔ یہ دراصل اسی انتقامی جوش و خروش کا مظاہرہ تھا۔

آنحضرتؐ مدینہ سے نکل چکے تھے۔ بالآخر مکہ والوں سے بدر میں ۱۷ رمضان ۲ھ کی صبح کو مقابلہ ہوا۔ اللہ نے بے سروسامان مسلمانوں کی جن کی کل تعداد ۳۱۳ تھی مکہ کے ایک ہزار جنگ آوروں کے مقابلے میں ایسی مدد کی کہ قریش کی طاقت جو اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے ٹوٹ گئی۔ ان کے ستر آدمی جن میں بڑے بڑے سردار شامل تھے مارے گئے اور ستر گرفتار ہوگئے۔ ان کے مقابلے میں مسلمان شہدا کی کل تعداد ۱۴ تھی۔

یہ جنگ درحقیقت شوکت اسلام کا سنگ بنیاد تھی جس سے ملک عرب میں بحیثیت ایک قوت کے اس کا ظہور ہوگیا۔

اس جنگ میں یہ واقعہ خاص توجہ کے قابل ہے کہ آنحضرتؐ بدر میں پہنچ کر پہلے چشمے پر اتر پڑے تھے حضرت حباب بن منذر نے پوچھا کہ یہاں ٹھہرنے کا حکم الہامی ہے جس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں یا آپ نے خود جنگی تدبیر کے لحاظ سے اس مقام کو منتخب فرمایا ہے۔ جواب دیا کہ یہ خود میری رائے ہے۔ حباب نے کہا کہ یہ جگہ موزوں نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ آگے بڑھ کر ہم قریش کی فرودگاہ کے قریب ترین چشمے پر قبضہ کرلیں اور اپنے لئے حوض بھر کر اردگرد کے چشموں کو پاٹ دیں تاکہ ان کو پانی نہ مل سکے۔ حضورؐ نے اس

مشورہ کو پسند فرمایا اور اسی کے مطابق عمل کیا۔ اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ صحابۂ کرام پر آپ کی پیغمبری اور امامت کی الگ الگ حیثیتیں واضح تھیں اور بحیثیت امام کے آپ کو مشورہ دینا جائز سمجھتے تھے اور آپ بھی بطیب خاطر ان کے معقول مشورہ کو قبول فرمالیتے تھے۔

دوسرے سال قریش نے بدر کے مقتولوں کا بدلہ لینے کے لئے چڑھائی کی اور کوہ اُحد کے متصل جنگ ہوئی جس میں قریش کا پلہ بھاری رہا۔ اس کے بعد انھوں نے غطفانی قبائل کو اپنے ساتھ ملایا اور ۵ھ میں ۲۴ ہزار کی جمعیت سے اسلام کو مٹانے کے لئے آئے۔ چونکہ مدینے کے اردگرد کے یہودی قبائل نے بھی بدعہدی کرکے ان کا ساتھ دیدیا اس وجہ سے مسلمانوں کی حالت بہت پرخطر ہوگئی لیکن اللہ نے مدد کی۔ دشمنوں میں پھوٹ پڑگئی۔ پھر جاڑے کے دن تھے اور تیز آندھیاں جن میں کھانا پکانا بلکہ خیموں کا سنبھالنا بھی مشکل ہوگیا۔ اور اتنی بڑی جمعیت کے لئے سامان رسد کی فراہمی۔ آخر عاجز آکر واپس چلے گئے۔

اس کے دوسرے سال صلح حدیبیہ ہوئی جس کی رو سے دس سال تک باہم امن وامان کے ساتھ رہنے کا فریقین نے عہد باندھا۔ اب مسلمان بے خطر قبائل میں جانے لگے اور اسلام کو سمجھانے اور اس کی تبلیغ کا راستہ صاف ہوگیا۔

یہ صلح اگرچہ دس سال کے لئے ہوئی تھی مگر تیسرے ہی سال قریش کے حلیف بنی بکر نے اس کے شرائط کی خلاف ورزی کی اور بنی خزاعہ کو جو رسول اللہؐ کے حلیف تھے حرم تک میں قتل کیا۔ اس وجہ سے ۱۰ رمضان ۸ھ کو آنحضرتؐ نے دس ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر قریش پر چڑھائی کی۔ یہ جنگ اپنی نوعیت میں تمام عالم میں انوکھی تھی یعنی مکہ حرم ہے۔ خونریزی بھی نہ ہو اور فتح بھی ہوجائے۔ چنانچہ سوائے ایک خفیف جھڑپ کے جس میں چند کافر ہلاک ہوئے اللہ کی مدد اور خاتم النبیین کی برکت سے مسلمان بلا جنگ کے وہاں داخل ہوگئے۔ اس فتح کے بعد اہل قریش مسلمان ہوگئے۔

نتائج

رسول اللہؐ نے جب مکہ سے ہجرت کی اس وقت تک قریش اور اس کے حلیف قبائل میں سے ایک مختصر جماعت نے اسلام کو قبول کیا تھا۔ دیگر قبائل کے صرف چند آدمی اسلام لائے تھے۔ لیکن کی زندگی کی تیرہ سال کی کوششوں اور جدوجہد کا یہ اثر ضرور ہوا تھا کہ سارے عرب میں آنحضرتؐ کی رسالت کا چرچا پھیل چکا تھا۔

ہجرت کے بعد مدینے کے باشندے زیادہ تعداد میں مسلمان ہوئے جن کو انصار کا لقب ملا۔ یہاں کے لوگوں میں اسلام کا ایسا عشق تھا کہ سب مسلمان ہو جاتے لیکن رکاوٹ یہ پڑ گئی کہ ان میں سے بعض اہل اثر یا تو اسلام کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے یا ان کو اپنی سرداری کے زوال کا خوف ہو گیا اس وجہ سے مسلمانوں کی دشمنی کرنے لگے ان کے ساتھ اور بھی ان کے ہم خیال ہو گئے۔ گو اسلام کے غلبہ کی وجہ سے ظاہر میں وہ مسلمان ہو گئے تھے مگر باطن میں مخالفت کرتے تھے۔ انھیں لوگوں کو قرآن نے منافق کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا باطن بھی ظاہر کے مطابق ہو جائے۔

آنحضرتؐ عرب کے قبائل کو اسلام کی طرف بلاتے۔ ان کے پاس وفود اور خطوط بھیجے لیکن قریش کے مغلوب ہونے سے پیشتر تک کوئی بڑا نتیجہ ظاہر نہیں ہوا

رسول اللہؐ کو اپنی رسالت کے فریضہ کا اس قدر خیال تھا کہ دن رات اسی فکر میں رہتے کہ سب کو نجات کا راستہ دکھا دیں اور جب لوگوں کو اس طرف آتے ہوئے نہ دیکھتے تو اپنی ذمہ داری کے احساس سے غمگین ہوتے۔ اس پر اللہ نے عتاب کے انداز میں کہا

لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین	تو شاید اس کے پیچھے جان گنوا دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔

پھر بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا کہ تمہارا کام صرف تبلیغ ہے۔ ہدایت سے

لگادینا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کافروں کی ذمہ داری سے آپ کو بری کر دیا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔
لاتسئل عن اصحاب الجحیم   جہنمیوں کی مسئولیت تیرے ذمہ نہیں ہے۔

اہل عرب کے توقف کی بڑی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسلام اور قریش میں جو لڑائیاں ہوتی تھیں وہ فیصلہ کن نہ تھیں۔ بدر میں اگر مسلمانوں کو فتح ہوئی تو احد میں قریش غالب رہے۔ نیز خندق کی لڑائی سے عربوں نے یہ سمجھا کہ مسلمان قریش سے رو در رو مقابلے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے اشاعت اسلام کی رفتار بہت سست تھی۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب کافروں سے مسلمانوں کا میل جول اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا اور انھوں نے اسلام کی تعلیمات سنیں اور ان پر غور کیا تو عام طور پر ان کا رجحان اسلام کی طرف ہو گیا بلکہ خود قریش کے بعض افراد پر اس کی حقانیت اثر کر گئی۔ چنانچہ اس صلح کے بعد ان کے دو بڑے سردار حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص مدینے میں آکر اسلام لائے۔ کسی نے حضرت عمرو بن عاص سے پوچھا کہ اس قدر عقل و فہم رکھتے ہوئے تم نے اتنی دیر کیوں لگائی جواب دیا کہ "ہماری قوم کے رؤسا ایسے تھے جن کی عقلیں پہاڑوں سے بھی زیادہ بھاری تھیں۔ ان کے پیچھے ہم جس راستے کو اختیار کر لیتے خواہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو آسان ہو جاتا۔ انھوں نے جب آنحضرت کی نبوت کا انکار کیا تو ہم نے بھی بلا سوچے ان کی تقلید کی۔ لیکن ان کے جنگ بدر میں مقتول ہو جانے کے بعد جب مہمات ہمارے سروں پر آ پڑیں اور ہم کو سوچنے کا موقع ملا اس وقت ہم نے دیکھا کہ معاملہ بالکل واضح ہے اور آنحضرت کے رسول برحق ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔"

لیکن پھر بھی اہل عرب قریش کے منتظر رہے ۔ سنہ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہو گیا تو آنکھیں کھل گئیں اور یقین ہو گیا کہ اسلام دین برحق ہے ورنہ بیت اللہ پر اس کا

تسلط ناممکن تھا۔ اسی کے ساتھ قریش جن کی مذہبی سیادت سارے عرب میں مسلم تھی اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر عربوں نے اس دین کی طرف قدم بڑھایا اور قبائل اپنے اپنے وفود آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیج کر اسلام میں داخل ہوگئے۔ چنانچہ ۹ھ تاریخ میں عام الوفود کے نام سے موسوم ہوگیا۔

فتح مکہ دراصل زمانہ ماسبق و مابعد کے درمیان حد فاصل ہے۔ قریش کا اسلام لانا گویا تمام عرب میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ تھا۔ کعبہ کے بتوں کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی عرب کے سارے بت خاک میں مل گئے۔

اصلاح کا صرفہ

مدنی زندگی کے ان دس سالوں میں کل چھوٹے بڑے غزوات اور سرایا جو پیش آئے ان کی تعداد ۸۲ ہے۔ ان سب میں جس قدر انسانی جانیں صرف ہوئیں ان کو بعض سیرت نگاروں نے کوشش کرکے شمار کرلیا ہے۔ فریقین کے مقتولین کی کل تعداد ۱۰۱۸ ہے۔ ۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ کفار و مشرکین۔ اسی طرح کل اسیران جنگ ۶۵۶۵ تھے جن میں سے صرف ایک مسلمان[۱] بقیہ مخالفین۔ ان میں سے چھ ہزار بنی ثقیف وہوازن کے لوگ ایک ہی جنگ حنین میں گرفتار ہوئے تھے جن کو حضور اکرم نے ازراہ لطف و مہربانی دوسرے ہی دن چھوڑ دیا۔ نیز یہ بھی قطعی طور پر ثابت ہوچکا ہے کہ ۳۴۸ قیدی دیگر مختلف غزوات میں بلا فدیہ رہا کئے گئے اور دو قیدی ایسے تھے جو اپنے سابقہ جرائم کی وجہ سے قتل کئے گئے۔ بقیہ ۲۱۵ جو رہ جاتے ہیں ان کی بابت ٹھیک پتہ نہیں چل سکا کہ ان میں سے کس قدر احساناً آزاد کئے گئے اور کس قدر فدیہ لے کر چھوڑے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے ان میں سے کچھ اسلام لاکر مسلمانوں میں شامل ہوگئے ہوں۔

سوچنے کا مقام ہے کہ دنیا کا یہ سب سے بڑا عظیم الشان دینی انقلاب کس قدر قلیل نفوس کے صرفہ سے عمل میں آیا۔ مجھے ان بزرگوں پر حیرت ہوتی ہے جو سرورِ عالمؐ

---

[۱] عمرو بن امیہ۔

کے ایسے معجزانہ کارناموں میں ان کی عظمت کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کے لئے محسوس خوارق عادات کی جستجو میں رہتے ہیں۔

تعلیم | رسالت کی غرض ہمیشہ سے تعلیمات الٰہی کی تبلیغ ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فریضہ یہی تھا۔

ہوالذی بعث فی الامیین رسولا منہم تیلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۲/۶۲	اللہ ہی ہے جس نے ان پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور پاکیزہ بناتا اور کتاب وحکمت سکھلاتا ہے۔ ہر چند کہ وہ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

رسول اللہ کی تعلیم تمام تر وہی تھی جو اللہ ان کے اوپر بذریعہ وحی کے اتارتا تھا۔ اسی کی تبلیغ فرماتے اور اسی پر عمل کر کے اپنی مثال سے ان کے اعمال وعقائد اور ظاہر و باطن کو پاکیزہ بناتے اور جہالت اور وحشت کی تاریکی سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لاتے۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور باذن ربہم ۱/۱۴	عظیم الشان کتاب جو ہم نے تیری طرف اتاری کہ لوگوں کو اللہ کے حکم سے تاریکی سے روشنی میں نکالے۔

یہی کتاب مجید آپ کا سرمایۂ تبلیغ و انذار تھی۔

واوحی الیّ ہذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۱۹/۶	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس کے ذریعے تم کو اور جس تک یہ پہنچے اس کو آگاہ کر دوں۔
قل انما انذرکم بالوحی ۴۵/۲۱	کہدے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعے سے آگاہ کرتا ہوں۔

قرآن میں بیسیوں جگہ آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے

اتبع ما یوحی الیک	اس کی پیروی کر جو وحی تیری طرف بھیجی جاتی ہے۔

اور آپ کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے

قل انما اتبع مایوحیٰ الیّ من ربی ۔ | کہدے کہ میں تو بس اسی کا تابع ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی آتی ہے ۔

الغرض رسول اللہؐ اپنے قول و عمل سے قرآن ہی کے معلم اور مبلغ تھے ۔ مورخین لکھتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے کسی نے حضور کے اخلاق کی صفت دریافت کی ۔ موصوفہ نے یہ مختصر اور حقیقی جواب دیا کہ آپ کا خلق قرآن تھا ۔

مکہ کی تیرہ سال کی زندگی میں ۹۳ سورتیں نازل ہوئیں جو قرآن کا تقریباً دو ثلث ہیں ۔ اس وقت تک چونکہ اسلام میں تھوڑے افراد داخل ہوئے تھے اور زیادہ تر خطاب کفار و مشرکین سے تھا اس وجہ سے احکامی آیتیں بہت کم نازل ہوئیں بیشتر ایمان کی ترغیبات ہیں ۔ بالخصوص توحید و معاد پر زیادہ زور ہے ۔ مختلف قسم کے دلائل سے شرک کی تردید کی گئی ہے اور بعث بعد الموت کا ثبوت دیا گیا ہے نیز اقوام سابقہ کے عبرت انگیز واقعات جا بجا دُہرائے گئے ہیں ۔

مدینہ میں آنے کے بعد اسلامی جماعت بن گئی اور حکومت الٰہی قائم ہو گئی اس لئے یہاں انفرادی تعلیمات کے ساتھ اجتماعی امور کے متعلق بھی آیات نازل ہوئیں اور دین الٰہی قرآن میں مکمل کر دیا گیا ۔

طریق تعلیم

رسول اللہؐ کا طریق تعلیم سرتاسر مربیانہ تھا ۔ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ایسی محبت سے پیش آتے کہ سب لوگ آپ کو شفیق باپ سے بڑھ کر سمجھتے ۔ جو ملنے کے لئے آتا اس کی تعظیم کرتے ۔ اپنا گدا یا کمبل اس کے لئے بچھا دیتے فقیروں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھتے ۔ ان کی مدد کرتے اور بیمار پرسی کے لئے جاتے ہر شخص کی عزت کا خیال رکھتے یہاں تک کہ صحابہ میں سے ہر ایک یہ سمجھتا کہ آپ مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتے ۔

قرآن کریم نے آپ کے خلق عظیم کی مدح کی ہے اور رؤف و رحیم کا خطاب دیا

ہے۔ آپ بدخواہوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی مہربانی کا برتاؤ کرتے اور ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرمؐ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کے بارے میں بدلا نہیں لیا، ہاں کوئی دین کی ہتک حرمت کرتا تو اس کو سزا دیتے۔

انجام کار اہل عرب ہر قسم کی دشمنی اور مخالفت کے بعد آپ کی طرف جھکے اور آپ کی ذات کو مجسم صداقت اور انسانیت کا مکمل نمونہ پاکر اپنا دینی اور دنیاوی مرکز بنالیا اور ان کی نگاہوں میں اللہ کی اطاعت کے سوا کوئی مقصد نہ رہا۔ تائید الٰہی نے ان کے دلوں سے قبائلی عداوتیں اور نسل پرستی کے کینے نکال کر ان کو باہم متحد اور اخوت دینی کے رشتہ میں منسلک کر دیا۔

لو انفقت ما فی الارض جمیعًا ما الّفت بین قلوبھم	اگر تو دنیا کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتا تو
ولکن اللہ الّف بینھم ۸	ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتا۔ اللہ نے ان کو جوڑ دیا۔

اس تالیف کا بڑا ذریعہ آنحضرتؐ کی رأفت و رحمت اور مربیانہ تعلیم تھی۔

ولو کنت فظًا غلیظ القلب لانفضوا من حولک ۳/۱۵۹	اگر تو سخت اور سنگدل ہوتا تو تیرے پاس سے لوگ منتشر ہو جاتے۔

طبقات صحابہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سارے اہل عرب کے دلوں میں اسلام راسخ ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان میں سے بعض بدوی قبائل نئے نئے مسلمان ہوئے تھے جن کے اندر جاہلیت کی عادتیں باقی تھیں۔ ان کا ذکر خود قرآن میں کئی جگہ ہے۔ بے شک شہری باشندوں میں اسلام کا اثر صادق تھا انھیں میں سے صحابۂ کبار اور رؤسا اسلام ہوئے۔

قرآن نے مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کا درجہ سب سے بلند رکھا ہے

والسّابقون الاوّلون من المھاجرین والانصار	مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین اور جن
والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ ۹	لوگوں نے خلوص کے ساتھ ان کی پیروی کی ان سے

اللہ راضی ہے اور وہ بھی اللہ سے راضی ہیں۔

پھر اس نے زمانے کے لحاظ سے صحابہ کے دو درجے کئے ہیں۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل۔ اولئک اعظم درجۃً من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا ۲۷ | تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور لڑے وہ برابر نہیں ہیں ان کا درجہ ان لوگوں سے بڑا ہے جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے۔

بعض مورخوں نے ان کے طبقات کے مراتب بارہ تک پہنچائے ہیں جن میں آخری وہ طبقہ ہے جو فتح مکہ کے بعد اسلام لایا۔

بہر صورت مجموعی حیثیت سے حضور نے اپنی تعلیم و کوشش اور اللہ کی تائید سے انھیں امیوں اور بدویوں سے ایسی امت تیار کی جو انسانی صفات میں ایسے بلند مرتبہ پر پہنچ گئی کہ اس نے نہ صرف قیصریت اور کسرویت کے بتوں کو توڑ کر حکومت الٰہی قائم کر دی بلکہ ان کی قدیمی تہذیبوں کو مٹا کر ان کی دینی اور دنیاوی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اعلائے کلمۂ حق میں وہ عظیم الشان کارنامہ چھوڑا جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ قرآن نے ان کی شان میں فرمایا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس | تم ان سب امتوں سے بہتر ہو جو انسانوں کی ہدایت کے لئے تیار کی گئی۔

الغرض خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تمام سابقہ نبیوں اور رسولوں سے زیادہ رسالت کے فریضہ پورا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے ایسی کتاب چھوڑی جو برخلاف جملہ آسمانی کتب کے قیامت تک کے لئے محفوظ ہے۔ اور کوئی طاقت اس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔ اور ایسی جماعت چھوڑی جو حکومت الٰہی کی علمبردار تھی اور جس نے طاغوتی طاقتوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ پھر کعبہ کو جو شرک کا مخزن بنا دیا گیا تھا۔ بتوں اور مشرکوں سے پاک کر کے اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے

مخصوص کیا اور اس کو نئے سرے عالم کے جملہ موحدوں کا مرکز بنایا۔ یہاں تک کہ زمین و آسمان کی فضا میں اس سرے سے اس سرے تک ہر دن رات میں پانچ وقت اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد انّ محمدؐ رسول اللہ کی صدا گونجنے لگی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خلافت راشدہ

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جن کے دلوں کو ایمان کے نور نے منور کر دیا تھا۔ اور جن کی بصیرتوں کے سامنے سے پردے اُٹھ چکے تھے قرآنی ہدایت کو سمجھا اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح حکومت الٰہی قائم کی اور جس طریق سے چلایا اس کو دیکھا اور یہ حقیقت بلا ریب و شک ان کے اوپر واضح ہوگئی کہ اسلام کا اصل مقصد یہی ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی دوسرا حاکم و مطاع نہ ہو اور اسی کی اطاعت کی جائے چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تجہیز و تکفین سے پہلے انصار و مہاجرین سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور کچھ ردوکد اور سوال و جواب کے بعد بالاتفاق حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کو خلیفۂ رسول اور امت کا مرکز تسلیم کر لیا۔ دوسرے دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ ہوئی جس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک مختصر تقریر کی۔ اس میں فرمایا۔

لوگو! قسم ہے اللہ کی نہ میں امارت کا کبھی خواہاں تھا نہ اس کی مجھ کو خواہش تھی، نہ میں نے کبھی پنہاں یا آشکارا اس کے لئے دعا کی لیکن مجھے خوف ہوا کہ کوئی فتنہ نہ برپا ہو جائے اس لئے اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ورنہ امارت میں کوئی راحت نہیں بلکہ یہ ایک ایسا بار مجھ پر ڈالا گیا ہے جس کے برداشت کی طاقت میں اپنے اندر نہیں پاتا اور بلا امداد الٰہی اس عہدہ سے برآ نہیں ہو سکتا۔

مجھے تم نے اپنا امیر بنایا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر ٹھیک کام کروں تو مدد دو اور اگر غلطی کروں تو اصلاح کرو۔ جب تک میں اللہ و

رسول کے فرمان پر چلوں تم میری اطاعت کرو، اور ان کے خلاف چلوں
تو میرا ساتھ چھوڑ دو۔

اس تقریر کا ایک ایک لفظ قرآنی تعلیم اور اسوۂ رسول کے عین مطابق ہے۔
خلافت کسی کا مخصوص حق نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی راحت یا دنیاوی نفع کی چیز ہے بلکہ اللہ
ورسول کی نمائندگی کی ذمہ داری کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔ خلیفہ اگر کام ٹھیک کرے
تو اُمت کا فریضہ ہے کہ اس کی اطاعت اور امداد کرے۔ اگر اس سے غلطی ہوجائے
تو راہ راست پر لائے۔ جو کوئی خلیفہ ہوجانے کے بعد اللہ ورسول کے فرمان سے
منحرف ہوجائے اس کو اپنی اطاعت لینے کا حق نہیں ہے اس لئے ایسے وقت میں
امت کو اس کا ساتھ چھوڑ کر دوسرے کو خلیفہ بنالینا چاہیے۔

یہ ہے مرکز ملت یعنی خلیفہ یا امام کی حقیقی حیثیت کہ اُمت حکومت الٰہی کے اجراء
ونفاذ کے لئے اس کو منتخب کرتی ہے۔ اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرکے اطاعت اور
اشتراک عمل کا عہد باندھتی ہے۔ اگر اس میں امام کی طرف سے کوتاہی ہو تو امت
کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کرے اور اگر اصلاح سے مایوسی ہوجائے تو معزول کردے۔

پہلا انتخاب

قرآن کریم استحقاق خلافت نیز انتخاب کی نوعیت وغیرہ کی تعلیم
سے خاموش ہے جس کا مطلب اصولاً یہ ہے کہ یہ امور انسانی
عقل کے سپرد ہیں کہ حالات وظروف کی مناسبت اور موقع کے لحاظ سے ان کو
سرانجام دے لے۔

حضرت ابوبکر کا انتخاب پہلا انتخاب تھا جس میں امت کے بہترین افراد شریک
تھے۔ انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے خلافت کے بہت سے مسائل میں
ہدایات ملتی ہیں۔

(۱) ان کے طرز عمل سے واضح ہوگیا کہ انتخاب خلیفہ یعنی نصب امامت

اُمت کا فریضہ ہے۔ امام منصوص کا کوئی شائبہ خیال یا ذکر صراحتاً یا کنایتہً اس موقع پر نہ تھا۔

(۲) یہ انتخاب جمہور کے شورے سے عمل میں آیا۔ یعنی بیعت بعد مشورہ اور اتفاق رائے کے ہوئی۔

یہ دونوں اصول نہایت واضح اور عقل کے مطابق ہیں جن میں نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ بحث کی گنجائش۔ بے شک عمل کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن وہ فروعی ہیں۔

حق خلافت

صحابہ کے خلافت کو جمہوری قرار دینے سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کو کسی قبیلے یا خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں کیا بلکہ اُمت کا ہر فرد اس میں برابر کا حق دار ہے۔ چنانچہ اس مجمع میں انصار خود اپنے میں سے سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے جو "الائمۃ من قریش"[۱] فرمایا اس کی تخصیص کا سبب بھی ساتھ ہی بیان کر دیا کہ اگر انصار میں سے قبیلۂ اوس کا کوئی خلیفہ ہوگا تو خزرج رشک کریں گے اور خزرج کا ہوگا تو اوس۔ اور اہل عرب بجز قریش کے کسی کی خلافت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ان کے اس قول کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ خلافت قریش کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ صرف یہ کہ اس وقت قریش کی عظمت عرب کے دلوں میں ہے اس لئے ان کی ذہنیت کے لحاظ سے اسی قبیلہ کے کسی فرد کا خلیفہ ہونا زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہنگامی مصلحتوں کا لحاظ تو خلیفہ کے انتخاب میں ہمیشہ رکھنا ہی ہوگا۔

---

[۱] یہ حضرت ابو بکر کا قول تھا جیسا کہ خود ان کی توجیہ سے ظاہر ہے۔ بعد میں ارباب غرض نے اپنے فائدے کے لئے اس کو آنحضرت کی حدیث بنا لیا اور یہ نہ سوچا کہ اللہ نے تو تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے جن کے حقوق میں کوئی تفریق نہیں ہوتی پھر اس کا رسول کیسے خلافت کو صرف ایک اور وہ بھی اپنے قبیلے کے ساتھ مخصوص کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ سے اس کے خلاف دوسری حدیث مروی ہے کہ تمہارے اوپر کوئی حبشی غلام بھی اگر امیر بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔

الغرض مدار انتخاب صرف اہلیت وصلاحیت ہوا اور یہ بھی سادہ اصول ہے۔ اسی کے مطابق حضرت ابوبکر کا انتخاب عمل میں آیا کیونکہ تمام صحابہ میں حسب ذیل خصوصیات ان کو حاصل تھیں۔

(۱) ابتدا ہی سے وہ آنحضرتؐ کے دوست اور مصاحب تھے اور جب حضور اکرم کی بعثت ہوئی تو سب سے پہلے جو عاقل بالغ آزاد مرد اسلام لایا وہ یہی تھے۔

(۲) اشاعت اسلام میں انھوں نے آنحضرتؐ کی عظیم الشان امداد کی اس وقت جبکہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا مددگار نہ تھا۔ اکثر سابقین اولین مثلاً حضرت عثمان بن عفان زبیر بن العوام۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ سعد بن وقاص۔ طلحہ بن عبید اللہ۔ ابوعبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید وغیرہ جن کے تاریخ اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ انھیں کے اثر سے اسلام لائے تھے۔ اس وجہ سے ان کے خلوص اور اسلامی خدمات کا نقش ہر دل پر تھا۔

(۳) دین کی حمایت۔ اللہ کی رضا جوئی اور نبی کی امداد میں اپنا تقریباً سارا مال واثاثہ صرف کر دیا۔

(۴) ہجرت میں یہی اکیلے رفیق راہ تھے اور اس کی ساری خدمات انھیں کے حصہ میں آئیں۔

(۵) جملہ مشاہد میں آنحضرتؐ کے ہمرکاب رہے کسی میں ساتھ نہیں چھوڑا جنگ تبوک میں صاحب علم اور حج اکبر میں امیر الحاج تھے۔

(۶) حضور اکرم کے قلب مبارک میں آخری دم تک عزت کے ساتھ ان کا اعتماد قائم رہا اور مرض الموت میں انھیں کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کا حکم دیا۔

ان تمام وجوہ سے جماعت صحابہ میں ان کو نمایاں امتیاز حاصل تھا۔ اور سب کو ان کے تقوے۔ دانائی۔ حلم اور صدق عزیمت پر ایسا بھروسہ تھا کہ کوئی دوسرا

ان کا حریف نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انھوں نے خود لوگوں سے فرمایا کہ یہ عمر اور ابوعبیدہ موجود ہیں ان میں سے کسی کو خلیفہ بنا لو تو ان دونوں حضرات نے یہ کہہ کر کہ ایسا کون ہے جو آپ کے اوپر مقدم ہو سکے۔ انھیں کے ہاتھ پر بیعت کی۔

انتخاب کی نوعیتیں

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ "ابوبکر کی بیعت فوری ہوئی جس کے شر سے اللہ نے بچا لیا"، لیکن سوا اس کے چارہ کار ہی کیا تھا۔ آنحضرت کی موجودگی میں یہ مسئلہ اٹھایا نہیں جا سکتا تھا اور آپ کے بعد اگر فوراً بیعت نہ ہوتی تو فتنہ برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے جو کچھ ہونا تھا لامحالہ عجلت میں ہوا مگر اصول کے مطابق ہوا۔ آئندہ کے لئے امت اس کے انسداد کی صورتیں نکال سکتی ہے۔ مثلاً خلیفہ کے بعد عارضی انتظام کر کے امیدوار کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلیفہ کے عمل کی مدت معین کر دی جائے جس کے اختتام پر امت اطمینان سے رائے زنی کر لے۔ کیونکہ کوئی نص ایسی نہیں ہے کہ خلیفہ مدت العمر کے لئے ہوا کرے۔

حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کے انتخاب کی ایک دوسری شکل ہوئی۔ جب صدیق اکبر کو اپنی موت کا احساس ہوا اس وقت امت کی مصلحت کے خیال سے ان کی یہ رائے ہوئی کہ کسی کو خلیفہ متعین کر دیں۔ حضرت عمر کی ذات میں ان کو ایک عظیم الشان خلیفہ کی صلاحیت نظر آئی تھی اس وجہ سے ارباب شوریٰ سے رائے لیکر ان کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کر دیا۔ یہ دوسرا طریقہ تھا خلیفہ کے انتخاب کا لیکن اس میں بھی شوریٰ جو جمہوریت کی اصل روح ہے ملحوظ تھا۔

خلیفہ ثالث کے انتخاب میں تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی حضرت عمر نے اپنی موت سے پہلے بڑے بڑے چھ صحابہ کو جو امت میں سب سے ممتاز اور ان کی رائے میں خلافت کی اہلیت رکھتے تھے نامزد کیا اور حکم دیا کہ میرے بعد یہ لوگ جمع ہو کر تین

دن کے اندر اندر اپنے میں سے ایک کو خلیفہ بنالیں۔ یہ طریقہ بھی تقریباً دوسرے طریقے کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے میں ایک شخص معین تھا اور اس میں محدود افراد میں سے ایک شخص غیر معین۔

حضرت علیؓ کے انتخاب کے موقع پر مدینے میں قدرتاً ان لوگوں کا غلبہ ہوگیا تھا جنھوں نے خلیفہ ثالث کو قتل کیا تھا۔ ان کی نگاہوں میں حضرت علیؓ سے زیادہ کوئی شخص خلافت کا مستحق نہ تھا۔ چنانچہ پہلے انھیں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی پھر دوسروں نے۔ حضرت طلحہ اور زبیر کی گردنوں پر تلوار رکھ کر بیعت کرائی گئی۔ بڑے بڑے صحابہ حضرت عثمان کے ناجائز قتل اور بیعت میں جبر دیکھ کر اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ سعد بن وقاص نے اپنا دروازہ بند کرلیا۔ عبداللہ بن عمر نے کہا کہ جب تک سب لوگ بیعت نہیں کرلیں گے۔ میں نہیں کروں گا۔ رؤسار انصار میں سے حسان بن ثابت۔ کعب بن مالک۔ مسلمہ بن مخلد۔ ابوسعید خدری۔ محمد بن مسلمہ۔ نعمان بن بشیر۔ زید بن ثابت۔ فضالہ بن عبید اور کعب بن عجرہ نے بیعت نہیں کی۔ دیگر مشاہیر میں سے حضرت مغیرہ بن شعبہ۔ عبداللہ بن سلام اور قدامہ بن مظعون بھی شریک نہیں ہوئے۔ کچھ لوگ اس خیال سے کہ ان کو بیعت نہ کرنی پڑے مدینے سے شام کی طرف چلے گئے۔ امرار ولایات نے بھی بیعت نہیں کی، اس لئے حضرت علی کا انتخاب نہ آزاد جمہوری انتخاب تھا اور نہ مکمل ہوسکا، کیونکہ اس وقت کی دنیائے اسلام ایک بڑے حصہ ملک شام نے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی۔ مگر باوجود اس کے لوگوں نے بالعموم ان کو خلفار راشدین ہی میں شمار کیا کیونکہ ان کی نگاہوں میں طریق انتخاب کوئی بڑی چیز نہیں تھی۔ اگر اصل مقصد یعنی حکومت الٰہی حاصل ہوجائے اور یہ بات حضرت علی کی خلافت میں تھی۔

مرکزیت دینی۔ رسول اللہؐ کے بعد ان چاروں خلفار کا زمانہ حکومت الٰہی

کا زمانہ ہے جس میں اعتقاداً وعملاً دین کا اصلی مقصود یعنی اکیلے اللہ کی فرمانبرداری اُمت کے پیش نظر رہا۔ ان خلفاء کرام کی ذات میں تمام اُمت کی دینی اور سیاسی مرکزیت تھی اور جملہ اجتماعی امور میں ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی اور ان کا حکم آخری حکم تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں سب سے پہلا مسئلہ جیش اسامہ کا پیش آیا جس کو رسول اللہؐ نے رومیوں اور غسانیوں کے مقابلے کے لئے تیار کیا تھا لیکن حضور کی بیماری کیوجہ سے رُک گیا تھا۔ وفاتِ نبوی کے بعد جب قبائل عرب کے ارتداد کی خبریں آنی شروع ہوئیں اس وقت لوگوں نے حضرت ابو بکر سے کہا کہ اب جب کہ نو مسلم قبیلے مرتد ہوتے چلے جا رہے ہیں اور مخالفت بڑھ رہی ہے یہ فوج باہر نہ بھیجی جائے۔ اُنھوں نے نہایت سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ آنحضرتؐ نے اس کے بھیجنے کا حکم دے دیا تھا اور انتقال سے پہلے بار بار زبان مبارک سے تاکید فرماتے رہتے تھے۔ بڑے بڑے صحابہ نے ہر چند اصرار کیا کہ اس لشکر میں مسلمانوں کے منتخب اشخاص ہیں اور قبائل عرب کی حالت نظر کے سامنے ہے ایسی صورت میں جمعیت کو متفرق کرنا مناسب نہیں ہے لیکن اُنھوں نے فرمایا:-

"قسم ہے اللہ کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ گر میں یہ بھی جان لوں کہ درندے مجھ کو پھاڑ کھائیں گے۔ تب بھی اس لشکر کو روانہ کروں گا۔ اور خواہ بستیوں میں میرے سوا کوئی رہ نہ جائے پھر بھی اس کو بھیجے بغیر نہیں رہوں گا۔"

چنانچہ یہ لشکر گیا اور چالیس دن بعد کامیاب واپس آیا اور اس کا بھیجنا اس وقت نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ دشمنوں کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر مسلمانوں کے پاس قوت نہ ہوتی تو یہ فوج کیسے بھیجتے۔

فتنۂ ردت میں جب نو مسلم قبائل نے زکوٰۃ روک دی اور حضرت ابو بکر نے ان سے جنگ کا ارادہ کیا تو صحابہ نے رائے دی کہ مصلحت وقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ نرمی

کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہا کہ جب وہ کلمہ پڑھتے ہیں تو آپ ان سے جہاد کیسے کرسکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:۔

"اے عمر! جاہلیت میں تو تم بڑے جابر تھے یہ کیا ہوا کہ اسلام لاکر خوار ہوگئے۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہوچکا اور دین کامل ہوچکا میرے جیتے جی اس میں کمی نہیں کی جاسکتی جو قبیلہ زکوٰۃ کا ایک جانور بھی روکے گا میں اس سے لڑوں گا۔"

حضرت عمر کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرے اوپر منکشف ہوگیا کہ ابوبکر کے دل کو اللہ نے جہاد کے لئے کھول دیا ہے۔ چنانچہ رؤسا قریش جنھوں نے آنحضرتؐ کے عہد میں اسلام کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی تھیں اب اس کی تلافی کا موقع پاکر اُٹھے اور فتنۂ ردّت کو اپنی جانفشانی سے تھوڑے عرصے میں دبا دیا جس سے اسلام آگے بڑھا ورنہ اس کی اجتماعی حیثیت اسی وقت ختم ہوجاتی۔ اسی طرح جمع قرآن کا معاملہ پیش آیا جس کو حضرت ابوبکر کی منظوری سے ایک جماعت نے انجام دیا۔

ان کا زمانۂ خلافت کل دو سال ۳ ماہ دس روز رہا۔ اس میں بھی ردّت اور ایران اور روم کی جنگوں کی مشغولیت رہی جس کی وجہ سے دینی مرکزی مہمات کمتر پیش آئیں۔ حضرت عمر کے عہد میں اس کے مظاہر بہت واضح نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک شوریٰ کی بہت اہمیت تھی۔ مہمات میں حضرت عثمانؓ۔ علیؓ۔ عباسؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ سے رائے لیتے۔ علماء قرآن میں سے حضرت علیؓ کے علاوہ ابن مسعود۔ زید بن ثابت ابوموسیٰ اشعری اور ابی بن کعب ان کے مشیر تھے عبداللہ بن عباس اگرچہ کم سن تھے مگر چونکہ عقل و علم میں ممتاز تھے اس وجہ سے ان کو بھی ساتھ رکھتے۔ کبھی کبھی جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو تمام لوگوں کو جمع کرلیتے۔

رسول اللہ کے زمانے سے جو امراء مقرر کئے جاتے تھے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ قرآن کے مطابق فیصلے کریں۔ اس میں نہ ملے تو سنت رسول کو دیکھیں۔ وہ بھی نہ ہو تو خود اجتہاد کریں۔ چنانچہ معاذ بن جبل کو یمن کی ولایت پر بھیجتے ہوئے حضورؐ نے یہی وصیت فرمائی تھی۔

حضرت ابوبکر کے عہد میں بیشتر امراء وہی تھے جو رسول اللہ کے مقرر کئے ہوئے تھے۔ ہر ناحیہ کا امیر ناظم بھی ہوتا تھا اور قاضی بھی۔ اور اجراء حدود شرعیہ و اقامت صلوٰۃ کا فریضہ بھی اسی کے ذمہ تھا۔ حضرت عمر نے اپنے عہد میں ملکی۔ فوجی عدالتی اور تعلیمی صیغے الگ الگ کر دئیے۔ ہر ایک پر جداگانہ اشخاص کو مقرر کرتے۔ امراء و قضاۃ کو رخصت کرتے وقت وہی ہدایت کرتے جو رسول اللہ نے معاذ بن جبل کو کی تھی اور اجتہاد کا اختیار دیتے۔ چنانچہ قاضی شریح کو جو اسلامی تاریخ میں سب سے ممتاز قاضی گزرے ہیں اور جو کوفہ میں ۵۷ سال تک اپنے عہدے پر رہے یہی نصیحت کی تھی کہ جب کسی معاملے میں قرآنی تعلیم یا سنت رسول نہ مل سکے تو اہل علم و صلاح سے مشورہ لینے کے بعد اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنا۔

امراء ولایات و قضاۃ اسی کے مطابق عمل کرتے لیکن اہم معاملات میں خلیفہ کو لکھتے۔ امام شعبی کا بیان ہے کہ حضرت عمر بعض امور میں مہینوں تک غور و فکر اور اہل علم سے مشورہ کرتے۔ پھر جواب لکھتے۔

نہ صرف ملکی و مذہبی بلکہ عام اقتصادی و عمرانی معاملات بھی انھیں کی رائے سے طے ہوتے تھے۔ فتح عراق کے بعد عثمان بن حنیف پیمائش اراضیات اور بندوبست کے کام پر لگائے گئے۔ اور تشخیص لگان خود حضرت عمر نے وہاں کے مرزبانوں اور کاشتکاروں کے مشورے سے کی۔ عراق نیز مصر میں نہریں انھیں کے حکم سے نکالی گئیں اور کوفہ، بصرہ اور فسطاط وغیرہ انھیں کی صواب دید سے آباد کئے گئے

فتح کے بعد عراق کو مجاہدین فوج میں تقسیم کر لینا چاہتے تھے مگر حضرت عمر نے اس کو حکومت کا حق قرار دیا۔ اسی طرح مصر میں حضرت عمرو بن عاص سے وہاں کے والی مقوقس نے اپنی پوری قبطی قوم کی طرف سے صلح کر لی تھی اور عہد کیا تھا کہ وہ رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سامان رسد سے مدد کرے گی۔ لیکن اسکندریہ کے اطراف کے باشندوں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ یعنی رومیوں کو مدد دی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ فتح کے بعد حضرت عمر نے ان کے جرائم معاف کر کے ان کو ذمیوں میں شامل کر دیا اور فرمایا کہ جاؤ اپنی ملکیتوں پر قبضہ کر دو اور اپنے گھروں میں رہو۔ یعنی انھوں نے پورے مصر کی فتح کو صلحاً قرار دیا۔

حضرت عثمان کے عہد میں بھی بعینہ یہی مرکزیت قائم رہی جو حضرت عمر کے زمانے میں تھی اور وہی نظام تھا جو چلا آتا تھا۔

مرکز کعبہ

اسلام کا اجتماعی مرکز مکہ مکرمہ ہے جہاں حج کے موقع پر دینی۔ دنیاوی ملکی اور سیاسی ہر قسم کے معاملے طے ہو سکتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں امراء ولایات حج کے موسم میں وہاں آتے۔ بیشتر خلیفۂ وقت خود امیر الحاج ہوتا اگر کسی وجہ سے نہ آسکتا تو کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجتا۔ خلیفہ اول اپنے دو سالہ عہد میں ایک بار خود تشریف لائے۔ دوسری بار حضرت عثمان کو اپنی جگہ بھیجا۔ حضرت عمر اس کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ہر سال آتے۔ صرف پہلے سال نہیں آسکے تھے اور عبدالرحمٰن بن عوف کو بھیجا تھا۔ حضرت عثمان بھی بجز دو سال کے کبھی اپنے عہد خلافت میں حج سے غیر حاضر نہ رہے۔ بے شک حضرت علی اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے اپنی خلافت میں کبھی مکہ نہ آسکے مگر نائب بھیجتے رہے۔ غالباً انھیں اندرونی شورشوں کی وجہ سے ان کے عہد میں شوریٰ بھی متروک رہا۔

الغرض خلافت راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں امت کی مرکزیت تھی۔ وہ اللہ

رسول کا نمائندہ تھا۔ اُمّت کے سامنے اور ہر امر میں مسئول اور ذمہ دار۔ حضرت عمر نے عمرو بن عاص سے حساب طلب کرتے ہوئے ان کو لکھا تھا کہ اگر اقصائے مصر میں بھی کوئی اونٹ ضائع ہو جائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اللہ مجھ سے اس کی باز پرس نہ کرے۔

منصب تشریع

امور شرعیہ میں خلیفہ کو کوئی اس قسم کی دینی ریاست حاصل نہیں تھی کہ جو حکم دیدے وہ مذہبی مسئلہ بن جائے بلکہ صرف احکام شریعت نافذ کرنے کا مجاز تھا۔ اور تشریع کی بنیاد قرآن اور سنّت (عمل رسول) پر تھی جس امر کے متعلق کوئی تعلیم ان دونوں میں نہ ملتی خلیفہ خود اور اس کے مشیر نظایر پر قیاس کر کے اس کا کوئی حکم نکالتے سب متفق ہو جاتے تو اس کو اجماع کہتے اور اگر باہم اختلاف ہوتا تو خلیفہ انھیں میں سے کسی صورت کو ترجیح دے کر اس کے مطابق حکم دے دیتا۔ اس کو اپنے عہدے کے لحاظ سے استنباط مسائل میں دیگر مجتہدوں سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا اس کا فریضہ بس یہ تھا کہ اُمّت کے امور کو قرآن اور اسوۂ رسول کی روشنی میں چلاتا رہے۔

بیعت کرتے وقت اس سے یہ شرط لی جاتی تھی کہ کتاب و سنّت کے مطابق عمل کرے گا۔ حضرت عثمان کی بیعت میں سنّت شیخین یعنی ابوبکر و عمر کا لفظ بھی بڑھایا گیا لیکن یہ زیادتی حضرت علی نے نہیں منظور فرمائی اس لیے حذف کر دی گئی کیونکہ شیخینؓ نہ معصوم تھے نہ ان کی تقلید کسی قرآنی حکم پر مبنی تھی۔

جن لوگوں نے عراق و مصر سے آکر حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا اور ان کو قتل کر ڈالا۔ وہ سب کے سب قرآن کی رو سے اللہ و رسول سے باغی اور واجب القتل تھے۔ اس لئے بیعت خلافت کے بعد صحابہ نے حضرت علی سے مطالبہ کیا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے۔ حضرت علی کو انھیں قاتلوں نے خلیفہ بنایا تھا اور وہی ان کے حامی تھے اس وجہ سے وہ ان سے قصاص نہ لے سکے اور اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔

سب سے پہلے حضرت طلحہ اور زبیر جو اُن چھ صحابۂ کبار میں سے تھے جن کو حضرت عمرؓ نے خلافت کے لئے نامزد فرمایا تھا اس مطالبے کے لئے اُٹھے۔ اپنے ساتھ حضرت عائشہؓ کو بھی لے لیا اور بصرہ میں پہنچ کر قصاص لینا شروع کیا۔ لیکن حضرت علی لشکر لے کر مقابلے کے لئے پہنچ گئے اور بہت جلد شکست دے دی جس میں یہ دونوں حضرات مارے گئے۔ مگر خلیفہ مقتول کے خون کے اصلی ولی امیر معاویہ تھے جن کے پاس شام کی منظم فوج تھی۔ ان سے اور حضرت علی سے صفین میں مقابلہ ہوا جس میں عراقی فوجوں کو چیرہ دست دیکھ کر شامیوں نے نیزوں پر قرآن اٹھائے۔ اس کی رو سے فیصلہ کرنے کے لئے فریقین کی طرف سے دو حکم مقرر ہوئے جنھوں نے حضرت علی اور معاویہ دونوں کو خلافت سے معزول کیا اور اُمّت کو اختیار دیا کہ اور کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کر لے۔

اب حضرت علی کو سخت دشواریوں کا سامنا ہوا۔ ایک تو خود ان کی فوج میں سے خارجیوں کی جماعت پیدا ہو گئی جو ان کے مقابلے کے لئے آہنی دیوار کی طرح جم گئی۔ دوسرے امیر معاویہ کو موقع مل گیا۔ انھوں نے شامیوں سے بیعت لے کر اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور قوت سے کام لینے لگے۔ تیسرے فیصلۂ ثالثی کے بعد

آئینی طور پر خود ان کی خلافت ختم ہو گئی۔ کیونکہ دونوں طرف سے یہ عہد تھا کہ جو متفقہ فیصلہ ہوگا اس پر فریقین کو عمل کرنا ہوگا۔ اسی وجہ سے اہل کوفہ ان کے احکام پر عمل کم کرتے تھے۔ انھیں حالات میں ایک خارجی عبد الرحمن بن ملجم نے ان کو خنجر سے ہلاک کر دیا۔

ان کی جگہ اہل عراق نے ان کے بڑے بیٹے امام حسن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ امیر معاویہ فوجیں لے کر کوفہ کی طرف آئے اور ان کو شکست دے دی۔ انھوں نے صلح کی خواہش کی۔ امیر معاویہ نے ایک سادہ قرطاس پر نیچے دستخط بنا کر ان کے پاس بھیج دیا کہ جو شرائط آپ چاہیں لکھ دیں۔ امام حسنؓ نے لکھا:۔

(۱) اہل عراق کو امن دیا جائے اور گزشتہ لڑائیوں کے انتقام میں کسی کی گرفت نہ ہو۔

(۲) صوبۂ اہواز کا خراج مجھے ملتا رہے اور میرے بھائی حسینؑ کو ۲۰ لاکھ درہم سالانہ دیئے جائیں۔

(۳) عطیہ اور صلے میں بنی ہاشم دوسروں سے مقدم رکھے جائیں۔

کتب تاریخ میں عہد نامہ کا مضمون یہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسلام میں سب سے پہلی شاہانہ مصالحت یہی ہے جس میں امیر معاویہ نے بیت المال کی رقم دے کر سلطنت حاصل کی جو جمہور کا حق تھی۔

بادشاہت ۲۵ ربیع الاول ۴۱ھ کو امام حسنؓ سے صلح کی تکمیل کے بعد امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت عام ہوئی۔ اور وہ ساری امت کے خلیفہ ہو گئے اسی تاریخ سے اسلامی خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔ کیونکہ یہ حکومت الٰہی نہ تھی جو رسول اللہ نے قائم کی تھی اور جس کو خلفاء راشدین نے اپنی کوشش سے قوی اور وسیع بنا کر دنیا کی قوموں کے لئے امن۔ ہدایت اور مساوات کا مرکز بنا دیا تھا۔ بلکہ انسانی حکومت تھی جس کو قرآن نے نبی اور رسول تک کے لئے جائز نہیں قرار دیا ہے۔

علماء اسلام میں امیر معاویہ کی موافقت اور مخالفت میں شروع سے دو گروہ ہیں جن میں بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ میں اس میں قدم نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ مذہبی بحث ہے اور میرے موضوع سے خارج۔ میرا حق اسی قدر ہے کہ واقعات کو پیش کروں۔

(۱) امیر معاویہ حضرت عثمان کے زمانے سے پورے شام کے والی ہو گئے تھے اور اندرونی طور پر ہر امر میں خود مختار تھے۔ اور بیت المال پر شاہانہ تصرف رکھتے تھے۔ چنانچہ اس معاملے میں حضرت ابو ذر نے ان سے جھگڑا بھی کیا تھا۔ اور خلیفہ ہو جانے کے بعد اُن رئیسوں اور سرداروں کو جن سے مقاصد میں تائید کی امید ہوتی بڑے بڑے انعامات اور عطیے دیتے۔

اس کے مقابلے میں خلافت راشدہ کے بھی چند واقعات سامنے رکھئے۔

خلیفۂ اوّل اپنے گزارے کے لئے بیت المال سے جو رقم لیا کرتے تھے مرتے وقت وصیت کر گئے کہ میری فلاں زمین بیچ کر وہ ساری رقم واپس کر دی جائے جو آج تک میں نے لی ہے۔ غالباً دل میں یہ اندیشہ تھا کہ اس کے مطابق میں امت کی خدمت نہیں کر سکا ہوں۔

خلیفۂ دوم نے ایک بار قیصر روم کو خط بھیجا تو ان کی بیوی ام کلثوم نے اسی قاصد کو قیصرہ کے لئے اپنی طرف سے کچھ تحفے دیئے۔ اس نے بھی ان کے لئے ہدیئے بھیجے جس میں موتی کی ایک بیش قیمت مالا تھی۔ حضرت عمر کو جب علم ہوا تو اس کو لے کر بیت المال میں داخل کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ ملکۂ روم نے بھیجا ہے جو نہ آپ کے زیر فرمان ہے نہ اس کے مال سے آپ کو کچھ تعلق ہے۔ فرمایا کہ قاصد مسلمانوں کا تھا اور اس کے اخراجات بیت المال سے دیئے گئے تھے۔ اسی طرح جب ان کے دونوں بیٹے عبداللہ و عبیداللہ جو عراق کی فوج میں تھے مدینے واپس آنے لگے تو والی بصرہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے کہا کہ یہاں خزانہ میں ایک رقم جمع ہے جس کو میں خلیفہ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں تم

دونوں اس کو بیکر یہاں سے تجارتی مال خرید لو مدینے میں پہنچ کر فروخت کر دینا اور رقم بیت المال میں داخل کر دینا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا حضرت عمر نے فرمایا کہ اس کا نفع کہاں ہے؟ جواب دیا کہ یہ مال والیٔ بصرہ نے ہم کو قرض دیا تھا۔ اب ہم نے وہ قرض واپس کر دیا۔ فرمایا کہ صرف امیر المومنین کے بیٹوں کو قرض دیا گیا تھا یا ساری فوج کو؟ یہ سُن کر بڑے بیٹے چپ ہو گئے۔ چھوٹے نے کہا کہ اس کی ذمہ داری بھی تو ہمارے اوپر تھی۔ اگر ضائع ہو جاتا تو ہم کو اپنے پاس سے دینا پڑتا۔ اس پر لوگوں نے فیصلہ کیا کہ منافع میں سے نصف ان دونوں کو دیا جائے اور نصف بیت المال میں داخل ہو۔

حکومت الٰہی اور حکومت انسانی کا فرق دیکھنے کے لئے یہ جزئی واقعات کافی ہیں۔ خلیفہ کا قبضہ بیت المال پر صرف محافظانہ ہے وہ ایک پائی کا بھی مالک نہیں ہے مگر مستبد اپنے آپ کو پائی پائی کا مالک سمجھتا ہے۔

(۲) مالک اشتر نخعی کو جب حضرت علی نے محمد بن ابوبکر والیٔ مصر کی امداد کے لئے بھیجا تو راستے میں مقام قلزم میں پہنچ کر ان کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے شبہ کیا کہ امیر معاویہ نے زہر دلوا دیا۔

(۳) امام حسنؓ کی وفات پر بھی ایسا ہی خیال کیا گیا۔

(۴) عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید جو حمص میں قیام پذیر تھے اپنے شجاعانہ کارناموں اور کریمانہ صفات کی وجہ سے شام میں اس قدر محترم اور ہر دلعزیز تھے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ امیر معاویہ کے بعد ان کے سوا کوئی دوسرا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ ایک دن اچانک ان کی موت واقع ہو گئی۔ پھر پتہ لگ گیا کہ ابن اثال نصرانی نے جو امیر معاویہ کا خاص طبیب ہے ان کو دوا میں زہر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے بھتیجے نے مدینے سے پہنچ کر اس طبیب کو شارع عام پر قتل کر دیا۔ جب گرفتار ہو کر امیر معاویہ کے سامنے پیش کئے گئے اور انھوں نے پوچھا کہ تم نے کیوں میرے طبیب کو مار ڈالا تو

کہا کہ ابھی میں نے ناموروں کو قتل کیا ہے آمر کا قتل کرنا باقی ہے۔

یہ سب اگرچہ مورخوں کے شبہات ہیں جن سے اصولاً کوئی ملزم نہیں قرار دیا جاسکتا مگر مشتبہ ضرور ہوجاتا ہے۔

(۵) کوفہ کے کندی قبیلے کے نامور رئیس حجر بن عدی اور ان کے تیرہ ساتھیوں کو وہاں کے والی زیاد نے اس جرم میں پکڑ کر امیر معاویہ کے پاس بھیجا کہ یہ ان کی برائی کرتے ہیں اور بغاوت کے لئے آمادہ ہیں۔ یہ لوگ جب مرج عذرا میں پہنچے تو وہاں امیر معاویہ کے حکم کے مطابق ان میں سے آٹھ آدمی قتل کر دیئے گئے جن میں سے حجر بھی تھے۔ حضرت عائشہؓ نے حجر کی گرفتاری کا حال سن کر عبدالرحمٰن بن حارث کو امیر معاویہ کے پاس سفارش کے لئے بھیجا تھا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے وہ قتل کئے جاچکے تھے۔ ام المومنین کو ہمیشہ اس کا افسوس رہا کیونکہ حجر بہت بزرگ اور عابد آدمی تھے۔

(۶) ان کے وُلاۃ بھی خونِ ناحق اور ظلم سے کم پرہیز کرتے تھے۔ خاص کر عراق میں زیاد کی سختیاں نہایت جابرانہ تھیں۔

(۷) ان کی زندگی کے آخری واقعہ یعنی یزید کی ولی عہدی کی بیعت نے جو انھوں نے فوجی قوت کے دباؤ سے لی رہی سہی حکومت الٰہی کی امید کا بھی خاتمہ کردیا۔ اور اسلامی اخوت و مساوات کو منہدم کر کے شہنشاہیت کی بنیاد ڈال دی۔

بعض لوگ ان کی طرف سے یہ معذرت کرتے ہیں کہ اس زمانے میں سلطنت کے حدود بہت وسیع ہوگئے تھے اور ذرائع الحاق واتصال موجود نہ تھے اس لئے خلافت کے امیدواروں کی جس قدر زیادتی ہوتی اسی قدر امت میں فتنہ اور تفرقہ کا زیادہ خوف ہوتا۔ ایسی حالت میں امیر معاویہ نے اگر اس کو ایک خاندان میں محدود کردیا تو کیا بیجا کیا۔

لیکن یہ معذرت نہ صرف اسلام سے بلکہ حالات سے بھی ناواقفیت پر مبنی ہے

اسلام کا اصل مقصد حکومت الٰہی کا قیام ہے۔ اگر وہ نہیں تو کچھ نہیں کیونکہ انفرادی اسلام سے اجتماعی فلاح ناممکن ہے۔ اس لئے وہ کسی قیمت پر فروخت نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر امیر معاویہ بجائے اپنے بیٹے کے امام حسین کو یا حضرت عمر کے بیٹے عبداللہ کو جن کو ابو موسیٰ اشعریؓ نے تحکیم کے موقع پر خلافت کے لئے موزوں قرار دیا تھا ولی عہد بنا دیتے تو غالباً نہ تو فتنہ ہوتا نہ فساد۔ بلکہ امت ان کی ممنون ہوتی۔

یزید کو ولی عہد بنانے میں امیر معاویہ نے حضرت ابوبکر کے عمل سے نظیر لی تھی لیکن صدیق اکبر نے حضرت عمر کو اپنا ولی عہد بنایا تھا جو نہ ان کے ہم قبیلہ تھے نہ رشتہ دار اس لئے بلا شبہ ان کا مقصد جمہوری تھا جس میں کوئی شائبہ ذاتی یا خاندانی غرض کا نہ تھا اور یہاں یزید کو ولی عہد بنانے کی غرض صرف یہ تھی کہ سلطنت اپنے خاندان میں رہے۔ اور افسوس کہ یہ غرض بھی پوری نہ ہوسکی کیونکہ ان کے بعد یزید کل ۳ سال آٹھ ماہ تخت پر رہا جس کے بعد سفیانی خاندان سے حکومت نکل گئی اور بنی مروان کے ہاتھ میں آگئی۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ میں عباسیوں نے ان ہی سے اس کو چھینا۔

صحابہ کا سکوت

صحابہ کرام جو آنحضرت اور خلفاء راشدین کا زمانہ دیکھ چکے تھے بالعموم یہ سمجھتے تھے کہ کیا اس کے خلاف بھی کوئی طریقہ اسلامی حکومت کا ہو سکتا ہے۔ اس لئے حضرت حسن کے بجائے معاویہ خلیفہ ہو گئے تو کیا ہوا۔ کیوں کہ شخصیتوں کی اہمیت ان کی نگاہوں میں زیادہ نہیں تھی۔ امیر معاویہ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ فیاضی اور مہربانی سے پیش آتے۔ اگر کوئی سخت بات کہتا تو اس کو برداشت کرتے بلکہ اس کی اور مدارات کرتے۔ احنف بن قیس بنی تمیم کے میر قبائل کوفہ کے سب سے بڑے رئیس اور شجاعت و مروت و دیگر صفات کی وجہ سے جملہ عربی رؤسا میں ممتاز تھے۔ جب تلوار میان سے نکالتے تو بے چون و چرا ایک لاکھ تلواریں ساتھ دینے کے لئے نکل پڑتیں۔ جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھے۔ خلیفہ ہو جانے کے بعد امیر معاویہ

کبھی کبھی ان کو دمشق میں بلاتے اور بہت اکرام کے ساتھ پیش آتے۔ ایک بار اثنائے گفتگو میں ان سے کہا کہ صفین میں تمہاری شرکت کی خلش کبھی کبھی دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ احنف نے جواب دیا کہ اب تک وہی دل ہمارے سینوں میں ہیں اور وہی تلواریں ہمارے میانوں میں ہیں۔ اگر تم جنگ کی طرف ایک بالشت بڑھنا چاہتے ہو تو ہم ایک ہاتھ بڑھنے کو تیار رہیں۔ باوجود ان باتوں کے ان کی توقیر اس حد تک کرتے کہ جس والی کو وہ ناگوار سمجھتے اس کو فوراً بدل دیتے۔

اس طرح پر انھوں نے اپنے استبداد کو حلم اور کرم سے چھپا رکھا تھا چنانچہ ان کے پورے عہد میں جو ۲۰ سال رہا نہ کوئی فتنہ برپا ہوا نہ کوئی بغاوت رونما ہوئی اور بجز خوارج کے کوئی ان کی مخالفت کے لئے نہ اٹھا۔

بے شک صحابۂ کرام میں ایسے لوگ بھی تھے جو انسانی حکومت کے مظاہر آنکھوں سے دیکھتے تھے مگر ان کی قوت کے آگے اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔ اس وجہ سے لا یکلّف اللہ نفساً الّا وسعہا (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا) کے مطابق مجبوراً خاموش رہے۔

واقعۂ کربلا

امیر معاویہ کے بعد جب ان کا بیٹا یزید خلیفہ ہو گیا تو امام حسینؓ جن کا رتبہ اس وقت صحابہ میں ممتاز تھا مقابلے کے لئے کھڑے ہوئے۔ مگر اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکے بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس استبداد کو توڑنے کے لئے جس طاقت کی ضرورت تھی اس کو فراہم کرنے کی طرف انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ مدینے سے مکے آجانے کے بعد پورا موقع حاصل تھا کہ کچھ عرصہ کوشش کرکے امت کے بہت سے افراد اور بڑے بڑے لوگوں کو اپنے ساتھ کر لیتے لیکن انھوں نے اسی کو کافی سمجھا کہ کوفہ میں جہاں سے ان کی طلبی کے خطوط آ رہے تھے مسلم کو بھیج کر اپنی امامت کی بیعت لیں۔ حالانکہ اہل کوفہ کی بیوفائی کا حضرت علی اور امام حسن کے زمانوں میں خود

ان کو تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ بیعت بھی والیوں کے ڈر سے مخفی سازش کی طرح راتوں کو چھپ چھپ کر لی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت کیا کام دے سکتی۔ چنانچہ جب مسلم ابن زیاد کے قصر پر حملے کے لئے بڑھے اور یا منصور کا نعرہ لگایا تو اٹھارہ ہزار آدمیوں میں سے جو ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے کل چار ہزار جمع ہوئے۔ اس وقت ابن زیاد کے پاس پچاس آدمیوں سے زیادہ نہ تھے انہیں کے خوف سے تقریبًا وہ سارے کے سارے مسلم کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آخر مسلم معہ اپنے بیٹوں کے گرفتار کرکے قتل کر دئے گئے اور جب امام حسین وہاں پہنچے تو مدد کے لئے کوئی جماعت تیار نہ ملی۔

بنی مروان

مروان اپنی خلافت مکمل کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا۔ اس کے بیٹے عبدالملک نے اپنے مخالفوں کو شکستیں دے کر پورے اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کیا۔ اس کے عہد میں استبداد کا مظہر بہت نمایاں ہو گیا۔ اپنے مقاصد کو پورا کرنے میں اس نے جن سختیوں سے کام لیا تھا ان کی معذرت میں کہا کرتا تھا کہ اگر شیخین کو بھی ایسے سرکش لوگوں سے پالا پڑتا جن سے ہم کو پڑا ہے تو لامحالہ وہ بھی یہی کرتے۔ اسی کا سب سے بڑا معتمد والی حجاج بن یوسف تھا جو اپنے ظلم و ستم میں چنگیز اور ہلاکو سے کم بدنام نہیں ہے۔ عبدالملک کے بیٹے سلیمان نے خلیفہ ہو جانے کے بعد اس غصے میں کہ حجاج نے اس کو ولی عہدی سے خارج کرانے میں ولید کی موافقت کی تھی اس کے تمام رشتہ داروں اور ماتحت عاملوں کو سزائیں دیں اور اس کے بھتیجے محمد بن قاسم فاتح سندھ کو بھی مروا ڈالا۔ اسی طرح موسیٰ بن نصیر جیسے سپہ سالار سے جس نے اندلس فتح کیا تھا ناقابل برداشت جرمانہ وصول کیا۔

بالعموم مروانی خلفا خاص کر ہشام بن عبدالملک نے اپنے شاہی اغراض کے لئے عربی قبائل میں زمانۂ جاہلیت کی عصبیت کو جسے اسلام نے فنا کر دیا تھا پھر زندہ کر دیا۔ اور ان کو باہم ایک دوسرے کا دشمن بنا کر لڑانا شروع کیا۔ بیشک ان میں سے حضرت عمر

بن عبدالعزیز کا عہد مستثنیٰ ہے ۔ انھوں نے خلیفہ ہوتے ہی رؤسا بنی امیہ کی ملکیتیں اور جائدادیں جن پر انھوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا تھا ان کے اصلی حقداروں کو واپس دلائیں ۔ بنی امیہ پر یہ امر نہایت گراں گزرا ۔ وہ ان کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان کو جن کا وہ بہت ادب کرتے تھے بلا لائے تاکہ ان کو سمجھائیں ۔ جب انھوں نے آکر سفارش کی تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا :-

"اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا ۔ آپ نے ایک ایسا چشمہ چھوڑا جس میں سب کو یکساں پینے کا حق تھا ۔ آپ کے بعد ابوبکرؓ وعمرؓ نے بھی اس کو اسی حالت میں رکھا جب وہ یزید ۔ مروان ۔ عبدالملک ۔ ولید اور سلیمان کے ہاتھوں میں آیا ۔ انھوں نے اس سے نہریں نکالیں جن کے باعث وہ خشک ہوگیا ۔ اب جب تک وہ پھر اپنی اصلی حالت پر نہیں لایا جائیگا لوگ اس سے سیراب نہیں ہوسکیں گے ۔"

فاطمہ نے یہ سن کر کہا کہ تمہارے بھائیوں کے اصرار سے میں تم کو سمجھانے آئی تھی مگر جب تمہارا خیال ایسا ہے تو میں اب کچھ نہ کہوں گی ۔ ان کے بعد ولی عہد یزید تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ نہ صرف اس سے بلکہ بنی امیہ سے خلافت کو نکال دیں اور کچھ عجب نہیں کہ بعض مورخوں کا یہ بیان صحیح ہو کہ اسی خوف سے بنی امیہ نے عجلت کرکے ان کو زہر دیدیا جس سے وہ ہلاک ہوگئے ۔ ان کا کل زمانۂ خلافت ڈھائی سال سے بھی کم رہا ۔ اس ڈھائی سال کے سوا بنی امیہ اپنی ۹۲ سال کی خلافت میں بادشاہت کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ حکومت الٰہی کا مفہوم ہی امت کے دماغوں سے جاتا رہا ۔ خلفاء راشدین نہ محافظ رکھتے تھے نہ دربان مگر خلفاء بنی امیہ کے لئے جامع مسجد میں بھی مقصورے بنائے جاتے تھے اور جب وہ نماز پڑھتے اس وقت دائیں بائیں مسلح سپاہی کھڑے رہتے ۔ خلافت راشدہ میں عمل کتاب وسنت پر تھا مگر عہد بنی امیہ میں جبر وقہر کی حکمرانی رہی ۔ خلفاء راشدین معمولی افراد کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور بیت المال کی خود اپنے مال سے زیادہ حفاظت کرتے تھے لیکن خلفاء بنی امیہ

شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے اور بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا تھا کہ جو شخص مجھ میں کوئی کجی دیکھے اس کو سیدھا کر دے اور عبدالملک نے بر سر منبر کہا کہ آج سے جو کوئی اس مقام پر مجھ سے کہے گا کہ اللہ کا خوف کرو اس کو قتل کر دوں گا۔

خلفاء راشدین عام مسلمانوں کی طرح بازاروں میں پھرتے مسجدوں میں جا کر نماز پڑھتے اور سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے لیکن ولید جس وقت مسجد نبوی دیکھنے گیا ہے اس وقت وہاں سے سب لوگ نکال دیے گئے۔ شیخ مدینہ سعید بن المسیب کی بزرگی کا اگر احترام نہ ہوتا تو وہ بھی اس میں رہنے نہ پاتے۔

خلفاء راشدین کے لئے کوئی امتیازی علامت نہیں تھی لیکن بنی امیہ کے عہد میں ہم عصائے خلافت کا بھی ذکر پاتے ہیں۔ نیز ان میں سے یزید بن عبدالملک اور ولید بن یزید کی نسبت مینوشی اور مغنیات کے راگ سننے کی روایتیں بھی ہمارے کانوں تک پہنچی ہیں۔

الغرض جس دن سے امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اسی دن سے حکومت الٰہی جو دین کا اصل مقصود تھی ختم ہوگئی۔ امت اسلامیہ جس کا ہر فرد آزاد اور صرف اکیلے اللہ کا بندہ تھا، رفتہ رفتہ قوت و غلبہ سے انسانی حکومت کی تابعدار اور رعایا بنائی گئی۔ اور بجز عمر بن عبدالعزیز کے بنی امیہ نے دینی قیادت ایک دن بھی نہیں کی جس سے امت میں مذہبی انتشار اور تشتت پیدا ہو گیا۔

بزرگان امت قرب عہد خلافت راشدہ کی وجہ سے ان سے خلفاء کا کام لینا چاہتے تھے مگر ان کی مخصوص سیاست سے قرآن خارج ہو چکا تھا اور خاندانی اغراض نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اس لئے دن بدن خرابیاں بڑھتی گئیں۔ اگر حکومت الٰہی ہوتی تو ان کی تقریباً صد سالہ خلافت میں بلاشبہ ساری دنیا میں اسلام پھیل جاتا۔

بنی عبّاس

عبّاسیوں نے کسی شرعی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض قرابت رسول کے دعوے پر خفیہ سازش اور کوشش سے خلافت حاصل کی۔ صورت یہ ہوئی کہ شیعہ جو مخفی طور پر اُمت میں اہل بیت کی امامت کی تلقین کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بنی اُمیّہ کا تختہ الٹ دیں۔ ان میں ایک فرقہ کیسانیہ تھا جو ابو ہاشم بن محمد بن الحنفیہ کو اپنا امام مانتا تھا۔ ابن الحنفیہ حضرت علی کے بیٹے تھے جنھوں نے اگرچہ عبدالملک بن مروان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی مگر ان کے شیعہ انھیں کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ابو ہاشم کو۔

خلفا بنی امیہ نے علی بن عبداللہ بن عباس کو ایک گاؤں حمیمہ جاگیر میں دیا تھا جو مدینہ سے دمشق کے راستے میں پڑتا تھا علی اسی گاؤں میں سکونت رکھتے تھے۔ اتفاقاً ابو ہاشم کا وہاں گزر ہوا اور وہیں بیمار ہو کر وہ انتقال بھی کر گئے۔ چونکہ اُنھوں نے کوئی بیٹا نہیں چھوڑا تھا۔ اس وجہ سے بنی عباس نے دعوٰی کر دیا کہ وہ علی بن عبداللہ کو اپنے حق امامت کی وصیت کر گئے ہیں۔ یہیں سے عباسیوں میں خلافت کا داعیہ پیدا ہو گیا۔ اور فرقہ کیسانیہ نے ان کی حمایت شروع کی لیکن علی صرف نام کے وصی تھے، کام جو کچھ کیا ان کے بیٹے محمد نے کیا اور وہی ان کے بعد امام بھی قرار پائے۔

محمد نہایت عقیل اور دانشمند تھے۔ اُنھوں نے صورت حال پر نظر ڈالی۔ علویہ کی ناکامی کے اسباب پر غور کیا اور سوچا کہ خلافت و سلطنت کو ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل کرنا صرف فوری جوش سے ممکن نہیں ہے تا وقتیکہ کثیر تعداد اور کافی قوت اس مقصد کے لئے تیار نہ کر لی جائے۔ اس وجہ سے اُنھوں نے اپنے شیعہ میں سے داعیوں

کی جماعت منتخب کی جو لوگوں میں صرف اہل بیت کی امامت کی تبلیغ کریں اور کسی خاص امام کا نام نہ لیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ تھا کہ شیعہ امامیہ کی محنت سے نفع اٹھائیں جو مدت سے اہل بیت کی امامت کی تبلیغ کر رہے تھے اور اس کے لئے راستے ہموار کر چکے تھے۔ دوسرا یہ کہ امام کے نام کی تعیین سے خطرہ تھا کہ بنی امیہ کو خبر ہو گی تو قتل کر دیں گے۔

تبلیغ کے لئے انھوں نے مختلف وجوہ سے خراسان کو زیادہ موزوں پایا اور دوسری صدی ہجری کے آغاز سے کام شروع کیا۔ مسلسل ۲۹ سال تک مخفی طور پر سوداگروں اور سیاحوں وغیرہ کے بھیس میں ان کے دعاۃ وہاں تبلیغ کرتے رہے اور جب پورا اثر پیدا کر لیا اس وقت امام موصوف کے خاص معتمد ابو مسلم خراسانی نے پہنچ کر قوت سے کام لینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ امراء بنی امیہ کو شکست دیتے ہوئے کوفہ پر پہنچ کر قبضہ کر لیا۔

اعلان خلافت

۱۳ ربیع الاول ۱۳۲ھ کو امام محمد کے بھائی سفاح کی خلافت کا اعلان کیا گیا۔ سفاح نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ میں حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنی قرابت رسول پر فخر کیا۔ پھر بنی امیہ کے ظلم و ستم کا ذکر کر کے کہا:-

"ہم اہل خیر و صلاح ہیں ہم سے ظلم و فساد کا اندیشہ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم لوگوں کو ہمارا زمانہ مل گیا اور اس دولت کی سعادت حاصل ہو گئی"

اس کے بعد اس کے چچا داؤد نے کہا:-

"ہم نے اس خلافت کو زر و جواہر جمع کرنے کے لئے نہیں حاصل کیا ہے۔ نہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عالیشان محلات اور باغات بنائیں اور ان میں نہریں نکالیں۔ بلکہ ہم نے دیکھا کہ ہمارے حقوق ہضم کئے جا رہے تھے۔ ہمارے بنی اعمام کی تحقیر کی جاتی تھی۔ امت کے جان و مال پر دست درازیاں ہوتی تھیں۔ ان کو ہم برداشت نہیں کر سکے۔ اب اللہ، رسول اور ان کے عم محترم عباس

سکا ذمہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھ کتاب و سنت کے مطابق برتاؤ رکھیں گے اور وہی طریقہ رکھیں گے جو رسول اللہ کا تھا۔"

لیکن ہوا کیا اس کے چند سال بعد منصور نے انبار کو چھوڑ کر بغداد کو دار الخلافہ بنایا اور باوجود جزرس ہونے کے اپنے اور اپنے بیٹے کے قصور و باغات کی تعمیر میں تقریباً دو کروڑ دینار خرچ کئے۔ پھر ہارون رشید کے زمانے میں وہاں امیروں اور رئیسوں کے لیے عالی شان محلات تعمیر ہوئے جن کو دیکھ کر سیاح حیران ہو جاتے تھے قصر خلافت۔ وزراء کے مکانات بالخصوص برامکہ کی عمارتیں ایسی تھیں کہ اس وقت تمام عالم میں ان کی نظیر نہ تھی۔ زر و جواہر بھی جمع کئے۔ چنانچہ منصور نے جب وفات پائی تو خزانے اس قدر معمور چھوڑے کہ مہدی بیدریغ ان کو خرچ کرتا رہا اور کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ یہ ختم ہو جائیں گے۔ ان کے دربار دارا اور کیخسرو کے درباروں کا نمونہ بن گئے۔ غنا و شراب عیش و نشاط وغیرہ سے دلچسپی ہوئی اور کتاب و سنت سے بس اتنا لگاؤ رہا کہ وہ مسلمان تھے۔ ورنہ ان کی مخصوص سیاست میں نہ کتاب کو دخل تھا نہ سنت کو۔

بنی امیہ سے انتقام

عباسیوں نے بنی امیہ سے جو ان کے یک جدی بھائی تھے انتقام لینے میں جس قساوت قلبی اور بیرحمی کا اظہار کیا اس کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ داؤد نے مکہ اور مدینے میں جس قدر بنی امیہ تھے سب کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بھائی سلیمان نے بصرہ میں یہی کیا۔ جن کو قتل کرتا ان کو کھنچوا کر راستے میں ڈال دیتا تھا۔ عبداللہ بن علی نے شام میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بنی امیہ کے ایک ایک فرد کو مار ڈالا۔ یہاں تک کہ جوش انتقام میں ان کے خلفاء امیر معاویہ۔ یزید اور عبدالملک وغیرہ کی قبریں کھدوا ڈالیں اور ان کی بوسیدہ ہڈیوں کو نکال کر پھینک دیا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ ہشام کی نعش صحیح سالم نکلی تھی صرف ناک گل گئی تھی اس کو کوڑوں سے پٹوا کر سولی پر چڑھا دیا۔ پھر آگ میں جلا کر راکھ ہوا میں اڑا دی۔

عراق میں سفاح نے خود بنی امیہ کے افراد کو قتل کیا حقیقت یہ ہے کہ استبداد کا مزاج شکی ہے چنانچہ ان کی یہ سخت گیری بنی امیہ ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ خود اپنے ارکان سلطنت پر بھی انھوں نے ہاتھ بڑھایا۔ ابوسلمہ خلال جو وزیر آل محمد کے لقب سے مشہور تھا اور جس نے اس دولت کے قائم کرنے میں بڑی خدمات انجام دی تھیں اس سے سفاح اس بنیاد پر ناراض تھا کہ اس نے خلافت کو آل علی کی طرف منتقل کرنا چاہا تھا۔ اس کے حکم سے ابومسلم نے اس کو قتل کرا دیا۔ سلیمان بن کثیر خزاعی شیخ النقباء پر بھی جس نے اس سلطنت کو قائم کرنے میں ابوسلمہ سے کم کوشش نہیں کی تھی ابومسلم نے یہی الزام لگایا کہ وہ آل علی کا خیر خواہ ہے اور اس کو بھی قتل کر دیا۔ سفاح کے بعد جب منصور تخت خلافت پر آیا تو اس کو ابومسلم کی طرف سے شک پیدا ہوا چنانچہ اس کو دربار میں بلوا کر قتل کرا دیا۔ نیز اپنے چچا عبداللہ بن علی کی طرف سے بھی اس کے دل میں خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے باوجود امان نامہ لکھ دینے کے بھی اس کو قید کر دیا جس میں وہ مر گیا۔

علویہ پر سختی اپنے بنی اعمام یعنی آل ابوطالب جن کے اوپر بنی امیہ کے مظالم دیکھ کر صبر نہیں کر سکے تھے اور ان کے انتقام کے لئے اُٹھے تھے ان کی طرف سے بھی ان کے دلوں میں بدگمانیاں پیدا ہوئیں، چونکہ منصور پہلے ان کی جماعت میں شریک رہا تھا اور ان کا راز دار اور ان کے منصوبوں سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے ان کی طرف سے اس کو ہر وقت خطرہ تھا۔

نفس زکیہ اہل بیت میں سے محمد بن عبداللہ جو نفس زکیہ کے لقب سے مشہور تھے اپنی خلافت کے لئے بہت کوشاں تھے۔ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان کے زمانے میں اکثر روسا بنی ہاشم نے ان کی امامت کی بیعت کی تھی اور ان کو مہدی تسلیم کیا تھا۔ اسی بیعت میں سفاح اور منصور بھی شامل تھے۔ اس وجہ سے جب عباسیوں نے خلافت قائم کی تو نفس زکیہ نے سفاح کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اور چاہا کہ خود اپنی

خلافت کا اعلان کریں۔ لیکن سفّاح ان کے والد اور چچا کے ساتھ سلوک کرتا تھا اس لئے اس کے زمانے میں خاموش رہے۔ نفس زکیہ کے دوسرے بھائی ابراہیم بن عبداللہ تھے جن کو خراسان کی ایک جماعت امام مانتی تھی اور ان کی حمایت کے لئے تیار تھی۔

سفّاح کے بعد جب منصور خلیفہ ہوا تو چونکہ اس کو ان دونوں بھائیوں کے ارادے معلوم تھے اس لئے ان کی طرف سے بہت بدگمان تھا۔ نفس زکیہ کا مرکز مدینہ منورہ تھا اور وہ اردگرد کے قبائل میں روپوش رہتے تھے۔ منصور وہاں کے عاملوں کو سخت سخت تاکید لکھتا تھا کہ ان کا پتہ لگائیں مگر وہ قاصر رہے۔ آخر اس نے رباح کو وہاں کا عامل بنا کر بھیجا۔ اس کو معلوم ہوا کہ وہ مدینے میں چھپ چھپ کر اپنی جماعت میں آتے ہیں اس لئے اس نے بنی حسن میں سے ۱۳ آدمیوں کو پکڑ کر منصور کے پاس بھیج دیا۔ اس نے ان پر ایسی سختیاں کیں کہ ان میں سے اکثر ہلاک ہو گئے۔

اب نفس زکیہ کو اپنے خاندان پر یہ مظالم دیکھ کر تاب ضبط نہ رہی۔ یکم رجب ۱۴۵ھ کو مدینے میں داخل ہوئے۔ رباح کو گرفتار کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ منصور کو جب اطلاع ہوئی تو اس نے پہلے کوفہ کو محصور کر دیا تاکہ شیعہ کا تعلق ان سے منقطع رہے پھر ان کو لکھا:۔

> از جانب ابوجعفر عبداللہ بن محمد (منصور) امیرالمومنین، بنام محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ)
>
> قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑیں اور دنیا میں فساد پھیلائیں ان کی سزا یہ ہے کہ مار ڈالے جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں برخلاف کاٹ لئے جائیں یا ملک بدر کر دیئے جائیں اس لئے میں اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کا واسطہ دلا کر عہد و پیمان کرتا ہوں کہ اگر اس سے پہلے کہ

میں تمہارے اوپر قابو پاؤں تم توبہ کر لوگے تو میں تمہاری اور تمہارے تمام بھائیوں کی اور ساتھیوں کی اور معتقدوں کی جو اس بغاوت میں شریک ہیں جان بخشی کر دوں گا۔ نیز دس لاکھ درہم تم کو دوں گا کہ جہاں چاہو رہو اور تمہاری جو ضروریات ہوں گی ان کو پورا کرتا رہوں گا۔ تمہارے اہل بیت اور شیعہ میں سے جو لوگ میرے قید خانوں میں ہیں ان کو چھوڑ دوں گا اور کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا۔ اگر اس پر تم راضی ہو تو اپنے کسی معتمد کو بھیج دو کہ آکر مجھ سے عہد نامہ لکھوالے۔

اس کے جواب میں نفس زکیہ نے لکھا :۔

از جانب محمد بن عبداللہ مہدی امیر المومنین بنام عبداللہ بن محمد

میں بھی تمہارے لئے اسی قسم کی امان پیش کرتا ہوں جس قسم کی تم نے پیش کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ خلافت ہمارا حق ہے اور ہمارے ہی شیعوں کی بدولت تم نے اس کو حاصل کیا ہے۔ ہمارے باپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ وصی اور امام تھے ہم جو ان کے بیٹے ہیں، زندہ ہیں پھر ہمارے ہوتے ہوئے تم کیسے اس کے وارث بن گئے۔ تمہیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بنی ہاشم میں سے جو نسبی فضائل و مفاخر ہم کو حاصل ہیں وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکے۔ زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو کے شکم سے ہم ہیں نہ کہ تم۔ خاص کر میں ہاشم کی اولاد میں نسب میں سب سے بہتر اور ماں باپ کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہوں میری رگوں میں امہات اولاد کا غیر عربی خون مطلق نہیں ہے۔ میرے نسب کو اللہ نے ہمیشہ ممتاز رکھا۔ دنیا میں سب سے افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ صحابہ میں میرے باپ حضرت علی اسلام میں

سب سے اول، علم میں سب سے فائق اور جہاد میں سب سے افضل تھے
میری ماں حضرت خدیجہ ہیں جنھوں نے اس امت میں سب سے پہلے نماز
پڑھی۔ پھر حضرت فاطمہ ہیں جو ان کی بیٹیوں میں سب سے بہتر اور جنتی
عورتوں کی سردار ہیں۔ زمانۂ اسلام میں ہاشم کے بہترین فرزند حضرت
حسن اور حسین ہیں جو بہشتی جوانوں کے سید ہیں۔ ان میں سے بڑے کا میں بیٹا
ہوں۔ اب دیکھو حضرت علی والدین کی طرف سے ہاشم کے بیٹے ہیں امام
حسن والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور میں والدین کی طرف
سے رسول اللہ کا بیٹا ہوں۔

اللہ نے ہمارا امتیاز ہمیشہ قائم رکھا۔ یہاں تک کہ جہنم میں بھی اس نے اس
کا لحاظ کیا یعنی میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو جنت میں سب سے بڑا درجہ
رکھتا ہے اور اس شخص کا بیٹا ہوں جو جہنم میں سب سے ہلکا عذاب پائے گا۔
اس طرح پر نیکیوں میں سب سے بہتر نیک اور گنہگاروں میں سب سے
کمتر گنہگار کا فرزند ہوں۔

میں اللہ کو گواہ کرکے تم کو ہر چیز کی سوائے کسی شرعی حد یا کسی مسلم یا معاہد
کے حق کے جو تمھارے ذمہ ہو امان دیتا ہوں اور میں بہ نسبت تمھارے
عہد کا زیادہ پابند ہوں۔ تم نے مجھ کو جو امان دی ہے وہ کونسی ہے؟
ابن ہبیرہ والی یا وہ جو تم نے اپنے چچا عبداللہ کو یا ابومسلم خراسانی کو دی
تھی ۔ ملخصاً"

کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ نسبی مفاخر جن کو رسول اللہ نے نخوت جاہلیت قرار
دے کر فتح مکہ کے دن پاؤں سے روند ڈالا اور جس کو قرآن نے مٹا کر سارے مسلمانوں
کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا انھیں کو یہ ائمہ اپنی امامت اور حق خلافت کے ثبوت میں

کس کس طرح پیش کرتے تھے۔ درحقیقت ان کے مقاصد شخصی تھے نہ کہ جمہوری۔

منصور کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس کے کاتب نے جواب لکھنے کی اجازت مانگی۔ منصور نے کہا کہ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ جب حسب نسب اور خاندان کے جھگڑے آپڑے تو خود مجھے جواب لکھنا چاہئے۔ اس نے لکھا:۔

از ابوجعفر عبداللہ بن محمد امیرالمومنین بنام محمد بن عبداللہ

تمہارا خط مجھ کو ملا۔ عوام کو برانگیختہ کرنے اور جہلا میں مقبول بننے کے لئے تم نے یہ نسبی مفاخر جوڑ رکھے ہیں جن کی ساری بنیاد عورتوں پر ہے۔ حالانکہ عورتوں کا وہ درجہ نہیں ہے جو چچا کا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اس وقت ان کے چچاؤں میں سے چار شخص زندہ تھے (حمزہ، عباس، ابوطالب اور ابولہب) ان میں سے دو اسلام لائے جن میں سے ایک میرا باپ تھا اور دو کافر رہے جن میں سے ایک تمہارا باپ تھا۔ تم نے عورتوں کا ذکر کرکے ان کی قرابت پر جو فخر کیا ہے یہ نادانی ہے۔ اگر عورتوں کو نسبی فضیلت میں سے کوئی حصہ ملتا تو ساری فضیلت رسول اللہ کی الدہ کے لئے ہوتی لیکن اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنے دین سے سربلند کرتا ہے تعجب ہے کہ ابوطالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو پر بھی تم نے فخر کیا ہے سوچو تو کہ ان کے بیٹوں میں سے کسی کو بھی اللہ نے اسلام کی ہدایت کی اور اگر کرتا تو اس کے زیادہ حقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ہو سکتے تھے لیکن وہ تو جس کو چاہتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔

تم نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ حضرت علی والدین کی طرف سے ہاشمی ہیں اور حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور تمہارا

نسب والدین کی طرف سے رسول اللہ تک پہنچتا ہے۔ اگر یہ واقعی کوئی فضیلت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہوتے لیکن وہ تو صرف ایک ہی طرف سے ہاشمی ہیں۔

پھر تم اپنے آپ کو رسول اللہ کا بیٹا کہتے ہو حالانکہ قرآن نے اس سے بالکل انکار کیا ہے۔

ماکان محمدٌ ابا احدٍ من رجالکم ۳۳ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے

ہاں تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو اور یہ بیشک ایک قریبی رشتہ ہے لیکن اس کے ذریعے سے کسی قسم کی میراث نہیں مل سکتی اور نہ اس سے تم امامت کے حقدار ہو سکتے ہو۔ اسی قرابت کی بنیاد پر تمہارے باپ حضرت علی نے ہر طرح پر خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی حضرت فاطمہ کو ابو بکرؓ سے لڑا کر رنجیدہ کرایا۔ اسی غصہ میں ان کی بیماری کی بھی کسی کو اطلاع نہیں کی اور جب انھوں نے انتقال فرمایا تو رات ہی کو بیجا کر ان کو دفن کر دیا۔ مگر کوئی ابو بکر کو چھوڑ کر ان کی خلافت پر راضی نہ ہوا خود آنحضرت کی بیماری کے زمانے میں بھی وہ موجود تھے لیکن نماز پڑھانے کا حکم آپ نے ابو بکر کو دیا۔ ان کے بعد حضرت عمر خلیفہ ہو گئے۔ پھر خلافت اصحاب شوریٰ میں آئی۔ اس میں بھی وہ انتخاب میں نہ آسکے اور حضرت عثمان خلیفہ ہو گئے۔ ان کے بعد انھوں نے طلحہؓ و زبیرؓ پر سختی کی۔ سعد بن وقاص سے بیعت لینی چاہی انھوں نے اپنا پھاٹک بند کر لیا جب علی گزر گئے امام حسن ان کی جگہ پر آئے۔ معاویہ نے شام سے لشکر کشی کی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ رقم ان سے لیکر اپنے شیعہ اور خلافت دونوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا اور مدینے چلے گئے۔ لہذا اگر تمہارا کچھ حق بھی تھا تم اس کو فروخت کر چکے۔

تمہارا یہ کہنا کہ اللہ نے جہنم میں بھی تمہارے امتیاز کا لحاظ رکھا کہ تمہارے باپ ابو طالب کو اس میں سب سے کمتر عذاب ملے گا۔ نہایت افسوسناک ہے۔ اللہ کا عذاب خواہ کم ہو یا زیادہ مسلمان کے لئے فخر کی چیز نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت ہے۔

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تمہاری رگوں میں عجمی خون مطلق نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم آنحضرت کے فرزند ابراہیم سے بھی بڑھ کر اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے تم سے افضل تھے۔ خود تمہارے خاندان میں زین العابدین تھے وہ تمہارے دادا حسن بن حسن سے بہتر تھے۔ پھر ان کے بیٹے محمد باقر تمہارے باپ سے بہتر اور ان کے بیٹے جعفر صادق تم سے بہتر ہیں حالانکہ ان سب کی رگوں میں عجمی خون ہے۔

تم یہ بھی دعوے کرتے ہو کہ نسب اور ماں باپ کے لحاظ سے تم کل بنی ہاشم سے بہتر ہو۔ بنی ہاشم میں سے رسول اللہ بھی ہیں۔ تمہیں یہ تو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قیامت کے دن اللہ کو منہ دکھانا ہے۔

صفین کے معاملے میں تمہارے باپ حضرت علی نے پنچوں سے پیمان کیا تھا کہ ان کے فیصلے پر رضامند ہو جائیں گے۔ تم نے یہ سنا ہو گا کہ پنچوں نے ان کو خلافت سے معزول کر دیا تھا۔ یزید کے عہد میں تمہارے عم حسین بن علی ابن زیاد کے مقابلے کے لئے کوفہ میں آئے اور جو لوگ ان کے حامی تھے انھیں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان کے بعد تمہارے خاندان کے کئی آدمی یکے بعد دیگرے خلافت لینے کے لئے اُٹھے۔ بنی امیہ نے ان کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم مستعد ہوئے اور ہم نے تمہارا اور اپنا سب کا انتقام ان سے لیا۔ وہ نماز کے بعد تمہارے اوپر جو لعنتیں بھیجا

کرتے تھے اس کو بند کیا تمھارے رتبے بڑھائے۔ اب انھیں امور کو تم ہمارے سامنے بطور حجت کے پیش کرتے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے حضرت علی کی فضیلت کا جو اظہار کیا ہے تو ہم ان کو عباس و حمزہ (رضی اللہ عنہما) سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں؟ وہ سب لوگ محفوظ گزر گئے اور حضرت علی ان جنگوں میں پڑے جن میں مسلمانوں کی خونریزی ہوئی۔

تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں سقایۂ حاج اور زمزم کے متولی حضرت عباس تھے نہ کہ ابوطالب۔ حضرت عمر کی عدالت میں تمھارے باپ نے اس کا دعویٰ بھی پیش کیا مگر فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔

رسول اللہؐ نے جس وقت وفات پائی اس وقت ان کے اعمام میں سے سوائے حضرت عباس کے اور کوئی زندہ نہ تھا۔ اس لئے کل اولاد عبدالمطلب میں سے آنحضرتؐ کے وارث وہی ہیں۔ پھر بنی ہاشم میں سے بہت لوگ خلافت حاصل کرنے کے لئے اُٹھے لیکن بنی عباس ہی نے اس کو حاصل کیا لہٰذا قدیم استحقاق اور جدید کامیابی حضرت عباس اور ان کی اولاد ہی کے حصہ میں آئی۔

بدر کی لڑائی میں تمھارے چچا طالب اور عقیل کی وجہ سے مجبوراً حضرت عباس کو بھی آنا پڑا۔ ورنہ وہ دونوں بھوکوں مرجاتے یا عتبہ اور شیبہ کے پیالے چاٹتے۔ ہمارے ہی باپ کی بدولت اس ننگ و عار سے بچے۔ نیز آغاز اسلام میں قحط کے زمانے میں حضرت عباس ہی نے ابوطالب کی امداد کی۔ پھر تمھارے چچا عقیل کا فدیہ بھی بدر میں اُنھوں نے ہی ادا کیا۔ الغرض جاہلیت اور اسلام دونوں میں ہمارے احسانات تمھارے اوپر ہیں۔ ہمارے باپ نے تمھارے باپ پر احسان کئے اور ہم نے تمھارے اوپر۔ اور جن رُتبوں پر

تم خود اپنے آپ کو نہیں پہنچا سکے تھے ان پر ہم نے تم کو پہنچایا اور جو انتقام تم نہیں لے سکے تھے وہ ہم نے لئے والسلام۔

ان خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت الٰہی کا تصور داعیوں سے کس قدر بعید ہو چکا تھا کہ ابوجعفر منصور جیسا اہل سنت کا عظیم الشان خلیفہ اور نفس زکیہ جیسا اہل بیت کا مہدی تسلیم کیا ہوا امام اس کو وراثتی تسلیم کر رہے ہیں صرف جھگڑا یہ ہے کہ یہ وراثت بیٹی کی اولاد کو پہنچتی ہے یا چچا کی۔[۵۱]

اس خط وکتابت کے بعد جس میں بجز فخر ومباہات اور خاندانی طعنے اور تشنے کے سوا اور کچھ نہ تھا منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ ولی عہد کو فوج دے کر مدینے کی طرف بھیجا۔ نفس زکیہ نے مقابلہ کیا مارے گئے اور ۱۴ رمضان ۱۴۵ھ میں ان کا سر کاٹ کر بغداد بھیجا گیا۔ نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم بصرہ میں تھے چند روز کے بعد انھوں نے بھی اپنی امامت کا جھنڈا بلند کیا اور بصرے سے اہواز تک قبضہ کر لیا عیسیٰ مدینے کی مہم سے فارغ ہو کر منصور کے حکم سے ان کی طرف آیا۔ ۲۵ ذیقعدہ ۱۴۵ھ کو ان کا سر بھی کاٹ کر منصور کے پاس بھیج دیا۔

امام مالکؒ ابوحنیفہ

نفس زکیہ اور ابراہیم دونوں بھائی آل علی میں شجاعت، تقویٰ اور علم وعمل میں ممتاز تھے لیکن تقدیر نے ان کا

۵۱۔ اسی قسم کی ایک بحث خلیفہ مامون الرشید اور امام علی رضا کی عیون الاخبار میں منقول ہے۔ مامون نے امام موصوف سے پوچھا کہ تم کس بنیاد پر خلافت کا دعویٰ کرتے ہو۔ بولے کہ رسول اللہ سے حضرت علی اور فاطمہ کی قرابت پر۔ مامون نے کہا کہ اگر حضرت علی کی قرابت کی بنیاد پر یہ دعویٰ ہے تو آنحضرتؐ نے ایسے ورثہ چھوڑے تھے جن میں سے بعض ان سے بھی زیادہ قریبی اور بعض انھیں کے درجہ کے تھے اور اگر فاطمہؓ کے رشتہ کی بنیاد پر ہے تو ان کے بعد اس کے حقدار حسن اور حسین تھے۔ ان کی موجودگی میں حضرت علی نے خلافت پر قبضہ کر کے ان کا حق کیوں غصب کیا۔ امام علی رضا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ساتھ نہیں دیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ امام مالک نے مدینے میں نفس زکیہ کی حمایت کا فتوےٰ دیا تھا۔ عباسیوں نے ان کو کوڑوں سے پٹوایا۔ اور عراق میں امام ابو حنیفہ ابراہیم کے طرفدار تھے۔ منصور نے ان کو بغداد میں قید کر دیا۔ اسی قید میں سنہ ۱۵۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

ان دونوں اماموں کی یہ نصرت و حمایت جہاں تک سمجھ میں آتا ہے صرف اس وجہ سے تھی کہ عباسیوں کے استبداد سے مسلمانوں کو کسی طرح نجات مل جائے۔ چنانچہ پہلے جب بنی امیہ کی شخصی حکومت اور ان کے مظالم سے لوگ تنگ تھے اس وقت بھی سنہ ۱۲۲ھ میں ہشام بن عبدالملک کے مقابلے میں امام زید کی ابو حنیفہ نے مدد کی تھی اور چار ہزار درہم ان کے پاس بھیجے تھے۔

انقلاب حکومت کے بعد عباسیوں سے جیسا کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کرینگے امید تھی کہ امت کو فلاح نصیب ہو گی لیکن ان کا استبداد بنی امیہ سے بھی زیادہ سخت نکلا۔ اس لئے جب نفس زکیہ اور ابراہیم نے ان کے خلاف خروج کیا تو ان دونوں اماموں نے ان کی حمایت کی۔ اس سے یہ نہیں خیال کیا جا سکتا کہ یہ حضرات نسبی یا خاندانی بنیاد پر کسی کو امامت کا حقدار سمجھتے تھے۔ بلکہ صرف یہ کہ ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے ان سے بمقابلہ عباسیوں کے امت کی بہتری کی امید رکھتے تھے۔

منصور کے بعد

عباسیوں نے چونکہ قرابت رسول کے دعوے پر حکومت حاصل کی تھی اور علویہ ان سے زیادہ اقرب تھے اس وجہ سے ان کو ہر وقت ان کی طرف سے خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ منصور کے بعد بھی اہل بیت پر سخت نگرانی رکھی جاتی تھی۔ مہدی نے ایک علوی کو اپنے وزیر یعقوب بن داؤد کے حوالہ کیا کہ اس کو قتل کر دو مگر اس نے رات کو اس کو چھوڑ دیا۔ اس جرم پر اس کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا جس میں وہ پندرہ سال تک رہا یہاں تک کہ اس کی بینائی جاتی رہی۔ ہادی

کے زمانہ میں حسین بن علی نے جو امام حسن کی اولاد میں سے تھے مقام فخ میں خروج کیا۔ بغدادی فوج نے پہنچ کر ان کا سر کاٹ لیا اور دربار میں بھیجا۔ ہارون الرشید کے عہد میں امام یحییٰ اور موسیٰ دونوں اس کے قید خانے میں مرے۔ جن کے متعلق مورخوں کے شبہات ہیں کہ اسی کے حکم سے ہلاک کئے گئے۔ برمکیوں کو بھی اس نے اسی جرم میں تباہ کیا کہ اس کو شبہہ ہوگیا تھا کہ یہ آل علی کے طرفدار ہیں۔ رشید اور نیز متوکل کے یہاں سے کسی کو مال یا عطیہ نہیں ملتا تھا جب تک کہ وہ آل ابی طالب کو برا نہ کہے۔ ان کے درباروں میں مروان بن حفصہ اور عبدالملک اصمعی جیسے ناصبیوں کی قدر تھی۔ اور عبداللہ بن عمار برقی جیسے لوگ جو حضرت علی کی منقبت میں شعر کہدیں ان کی زبان کاٹ لی جاتی تھی۔ الغرض عباسیوں کے ہاتھوں اہل بیت پر ایسے مظالم ہوئے کہ اب بنی امیہ کے عہد کو وہ جنت خیال کرنے لگے۔ ان کے شاعر نے کہا۔

یالیت جور بنی مروان عاد لنا   یالیت عدل بنی العباس فی النار

کاش بنی مروان کا ظلم پھر واپس آجاتا   اور بنی عباس کا عدل جہنم رسید ہوتا

آغانی میں ہے کہ ابو عدی شاعر نے منصور کے عہد میں بنی امیہ کا مرثیہ لکھا جب علویہ کو سنایا تو نفس زکیہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ان کے چچا نے کہا کہ بنی امیہ تو ہمارے دشمن تھے ان پر تم کیوں روتے ہو۔ بولے کہ بیشک ہم ان سے بیزار تھے۔ مگر ان میں پھر بھی مکارم اخلاق اور اعلیٰ صفات تھے۔ یہ عباسی تو ان سے بھی کم اللہ سے ڈرتے ہیں۔

مجھے ڈر ہے کہ میرے وہ بھائی جو تاریخی شخصیتوں سے عقیدت رکھتے ہیں یہ نہ کہنے لگیں کہ یہ گزشتہ خلفاء کی فرد جرم ہے۔ میرا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ حکومت الٰہی کی مقدس امانت جو رسول اللہ نے امت کے سپرد کی تھی اور خلفاء راشدین کے توسط سے اس کو ملی تھی اگر قائم رہتی تو نہ یہ مظالم ہوتے نہ خاندانی رقابتیں پیدا ہوتیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس کا کہ مستبد خلفاء نے اس کو انسانی حکومت میں تبدیل

کر دیا تھا اور اپنے خاندان میں محدود رکھنا چاہتے تھے جس کے باعث ہر وہ فعل جو ان کے اس مقصد کے خلاف ہوتا جرم ٹھہرتا۔ اسی لئے ان کی چند ایسی سختیاں دکھائی ناگزیر تھیں جو اُنھوں نے سلطنت کو اپنے خاندان میں محفوظ رکھنے کے لئے کیں۔ ان کے دیگر مظالم کا ذکر میں نے قصداً چھوڑ دیا کہ یہاں اس کا موقع نہ تھا۔ اکثر مسلمان مورخوں نے اموی اور عباسی خلفار کے کارناموں کو فخر کے ساتھ بیان کیا ہے بلکہ ان میں سے بعض کو بطل (ہیرو) بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلامی خلافت کے صحیح مفہوم اور اس کے حقیقی رتبے سے واقف نہیں تھے اور اس کو بھی بادشاہت ہی سمجھتے تھے۔ اس لئے دوسری قوموں کے بادشاہوں کے مقابلے میں ان کی برتری دکھانے کی کوشش کی اور اس کو اسلام کی خدمت سمجھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ شہنشاہیت کے لحاظ سے عبدالملک اور ولید یا منصور اور ہارون وغیرہ سے بہتر بادشاہ کونسی قوم پیش کرسکتی ہے مگر اسلام تو ابوبکر و عمر جیسے خلیفہ چاہتا ہے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائیں اور صاف صاف کہتے رہیں کہ ہم میں جو غلطی دیکھو اس کی اصلاح کرو۔

نظام سلطنت

جس وقت عباسیوں نے بنی امیہ سے خلافت حاصل کی اس وقت اس کا مفہوم ہی بدل چکا تھا اور سوائے شخصی سلطنت کے حکومت الٰہی کا خیال تک بھی دلوں میں نہیں تھا اس لئے ان کا نظام بھی وہی رہا جو بنی امیہ کا تھا۔ ولی عہدی کا بھی طریقہ وہی رکھا گیا جو بنی امیہ نے اختیار کیا تھا۔ یعنی اپنے عزیزوں اور بیشتر اپنے بیٹوں کو ولی عہد بناتے تھے۔ بلکہ اکثر ایک کے بجائے دو دو اور تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے جن پر علماء، صلحا، امرار، وزرار، حکام اور قضاۃ وغیرہ کے علاوہ اللہ، رسول، ملائکہ ملکہ جن بھی گواہ بنائے جاتے تھے تاکہ یہ جائداد خاندان ہی میں محفوظ رہے۔ لیکن بعد میں نزاعیں واقع ہوتی تھیں اور اُمت میں فساد بڑھتا تھا کیونکہ عہد کا احترام اُنھوں نے خود اپنی مثالوں سے اُٹھا دیا تھا۔

یہ بھی صرف ایک صدی تک رہا جب تک کہ ان میں قوت تھی۔ جب ترکوں کا غلبہ ہو گیا تو خلفاء کا عزل و نصب ان کے ہاتھ میں آگیا۔ پھر بنی بویہ اور سلجوق کے زمانوں میں تو کل اختیارات سلاطین کے ہاتھوں میں تھے۔ خلفاء صرف نام کے لئے رکھے جاتے تھے عباسیوں نے بھی بنی امیہ کی طرح ملک، فوج اور خزانے پر قبضہ کے سوا امت کی دینی قیادت کبھی نہیں کی بلکہ اس کو علماء ہی کے ہاتھوں میں چھوڑے رکھا۔ چونکہ ان کے عہد میں علوم دخیلہ مسلمانوں میں آئے تھے جن کا اثر خیالات اور عقائد پر بھی پڑا اس وجہ سے نئی نئی مذہبی بحثیں چھڑیں اور اختلافات بہت بڑھ گئے۔ مامون الرشید نے ان کو مٹانے کی کوشش شروع کی لیکن دین پر قبضہ علماء کا ہو چکا تھا اس لئے اس کو عقلیت (اعتزال) کے دروازے سے داخل ہونا پڑا اور سخت ناکام ہوا۔

بنی امیہ کے عہد میں عربی حکومت اور سادہ زندگی ہونے کے باعث سلطنت کے لئے کسی خاص قانون کی ضرورت نہیں پڑی لیکن بنی عباس نے ایک مرکزی قانون کی ضرورت محسوس کی جس پر سب چلائے جائیں۔ ابن المقفع نے خلیفہ منصور کے سامنے حکمرانی کے متعلق جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں بھی اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا کہ اجماعی اور متفق علیہ نصوص کے مطابق ایک ایسا قانون بنایا جائے جس سے جمہور اور قضاۃ سب واقف ہوں۔ پھر زمانے کی ضروریات کے مطابق اس کی اصلاح و ترمیم ہوتی رہے۔ منصور نے امام مالک سے درخواست کی کہ موطا[1] کو سلطنت کا قانون عام

---

[1] امام مالک کی موطا خیر القرون کے عمل متواتر کا مجلد دینی کتب سے زیادہ اعتماد کے قابل مجموعہ ہے۔ کیونکہ مدینہ منورہ عہد رسالت و خلافت راشدہ میں اسلام کا مرکز رہا۔ اس میں علماء تاریخ کے اندازہ کے مطابق کم و بیش بارہ ہزار صحابہ تھے جن میں سے تقریباً دس ہزار وہیں رہے اور وہیں فوت ہوئے۔ بقیہ دو ہزار عراق، مصر، شام اور یمن وغیرہ میں پھیلے۔ اس لئے شریعت کا اصل اور صحیح ذخیرہ مدینے ہی میں ہو سکتا تھا۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جس قدر

قرار دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف حصوں میں لوگوں کا عمل مختلف طریقوں پر رائج ہو چکا ہے۔ بولا کہ کیا مضائقہ ہے ہم بزور ان کو اس کے اوپر چلائیں گے مگر وہ راضی نہ ہوئے پھر ہارون الرشید نے بھی اپنے زمانے میں ان سے یہی درخواست کی مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ آخر امام ابو یوسف جو امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید تھے بغداد کے قاضی مقرر کئے گئے انھوں نے رفتہ رفتہ فقہ حنفی کو عباسی سلطنت کا قانون عام بنا دیا۔

عباسی خلافت کی مدت چونکہ بہت طویل ہوئی اور بغداد کا علمی اور دینی اثر امت پر غالب رہا اس وجہ سے رسماً اور تقلیداً یہ عقیدہ دلوں میں راسخ ہو گیا کہ خلافت کا حق صرف بنی عباس کو ہے۔ ۲۹۵ھ میں فاطمیہ نے افریقہ میں اپنی خلافت کا دعویٰ کیا۔ یہ دیکھ کر سن ۳۱۶ھ میں عبدالرحمٰن ناصر نے اندلس میں اپنی خلافت کا جھنڈا بلند کر دیا مگر بالعموم امت عباسی ہی خلافت کو باوجود اس کی تمام کمزوریوں کے صحیح اور جائز سمجھتی رہی اور خود مختار سلاطین خلیفہ عباسی ہی سے فرمانروائی کی سند حاصل کرتے تھے۔ اسی عقیدے کی بنا پر زوال بغداد کے بعد مصر میں عباسی خلافت قائم کر دی گئی جو اگرچہ وہاں کے سلاطین کے ہاتھوں میں تھی مگر اسلامی ممالک کے تاجداروں کو حکومت کی سند دیتی تھی۔ صحیح مرکز کا تصور نہ سلاطین کے دماغوں میں تھا نہ علما کے۔

دینی کتابیں ہیں ان میں سب سے پہلی کتاب جو مدون ہوئی وہ مدینے میں ہوئی یعنی یہی موطا۔ اس میں اہل مدینہ کے پاس اسوۂ رسول و خلفاء راشدین و صحابۂ کرام و تابعین عظام کا جو کچھ سرمایہ تھا اور جس قدر وسائل اور فتاوے ان کے معمول بہ تھے وہ سب جمع کر دیے گئے ہیں یہ کتاب صحیح بخاری سے نصف صدی پہلے لکھی گئی ہے۔

خوارج

اس جماعت کا آغاز جنگ صفین میں واقعۂ تحکیم سے ہوا۔ امیر معاویہ نے جب شکست محسوس کی اس وقت ان کے حکم سے شامیوں نے نیزوں پر قرآن بلند کئے اور عراقی فوجوں سے پکار کر کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کتاب اللہ ہے۔ اگر تم فنا ہو گئے تو مشرقی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا اور اگر ہم مٹ گئے تو مغربی حملوں کی مدافعت کے لئے لوگ کہاں سے آئیں گے۔ سادہ دل عراقیوں نے یہ دیکھ کر لڑائی سے ہاتھ روک لیا اور بولے کہ ہم کو کتاب اللہ کا فیصلہ منظور ہے۔ حضرت علی نے کہا کہ اللہ کے بندو! تم حق پر ہو اپنے ہاتھ نہ روکو فتح میں اب دیر نہیں ہے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی کتاب اللہ کی طرف بلائے اور ہم انکار کر دیں۔ مسعر ابن فدکی اور اس کے ساتھیوں نے تو یہاں تک کہا کہ آپ کتاب اللہ کے فیصلہ کو منظور کریں نہیں تو ہم ساتھ چھوڑ دیں گے۔ مجبوراً حضرت علی کو لڑائی بند کر کے تحکیم پر راضی ہونا پڑا۔

لیکن عراقی فوج کی ایک جماعت نے مخالفت کی اور کہا کہ حکم الٰہی میں تم نے انسانوں کو کیوں ثالث مانا ہم سوائے اللہ کے کسی کا حکم نہیں مانیں گے۔ چنانچہ ثالثی نامہ لکھے جانے بعد حضرت علی اپنی فوج لے کر جب واپس چلے تو راستے بھر ان میں جھگڑے ہوتے رہے کوفہ کے قریب پہنچ کر اس میں سے بارہ ہزار آدمی الگ ہو گئے اور مقام حروراء میں جا کر خیمے ڈال دئے۔

حضرت علی نے پہلے حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کی فہمائش کے لئے بھیجا پھر خود بھی پہنچ گئے اور پوچھا کہ تم لوگ ہماری جماعت سے کیوں الگ ہوئے ہو۔ خوارج نے کہا اس لئے کہ آپ نے اللہ کے حکم میں انسانوں کو ثالث بنایا۔ حضرت علی نے جواب

دیا کہ میں نے تو پہلے ہی اس کے قبول کرنے سے منع کیا تھا مگر تم لوگوں نے خود اصرار کرکے مجھے مجبور کر دیا ۔علاوہ بریں یہ شرط لکھی گئی ہے کہ ثالث قرآن کے مطابق فیصلہ کرینگے لہذا قرآن پر چلنے میں کیا قباحت ہے ۔خوارج بولے کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمارا ثالثی قبول کرنا کفر تھا اور ہم اس کفر سے توبہ کرتے ہیں ۔ آپ بھی اگر تائب ہو جائیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں ۔

ان کے نظریہ کی توضیح یہ ہے کہ حضرت علی خلیفہ برحق تھے ۔ ان کی بیعت واجب تھی جن لوگوں نے اس سے انکار کیا اور مقابلے کے لئے آئے وہ اللہ و رسول سے باغی ہیں جن کے لئے قرآن میں قتل کا حکم ہے ۔ اس لئے معاویہ کی جماعت از روئے قرآن واجب القتل ہے ۔ لہذا اللہ کا حکم موجود ہوتے ہوئے ان کے ساتھ مصالحت کرنے اور ان کے معاملے میں اشخاص کو ثالث بنانے کے کیا معنے ۔ اور چونکہ حضرت علی اس جرم کے مرتکب ہوئے کہ اُنھوں نے قرآنی حکم میں اشخاص کو ثالث بنایا اس لئے ان کی خلافت ناجائز ہے ۔

اس وقت حضرت علی کے کہنے سے وہ واپس آگئے ۔ غالباً اُنھوں نے خیال کیا کہ تحکیم کو جو ہم نے کفر سمجھا ہے اس میں حضرت علی بھی ہمارے ہم خیال ہیں ۔لیکن فیصلہ ثالثی کے وقت جب حضرت علی نے ابو موسیٰ اشعری کو چار سو آدمیوں کے ہمراہ دومتہ الجندل کی طرف روانہ کیا تو خوارج مخالفت کے لئے کھڑے ہو گئے ۔عبد اللہ بن وہب راسبی کے مکان پر جمع ہو کر اس کو اپنا امیر بنایا اور طے کیا کہ اس شہر کو جہاں کے باشندے ظالم ہیں چھوڑ کر باہر نکل جانا اور امر بالمعروف کرنا چاہئے ۔

یا تو اس خروج یا امام کی اطاعت سے خروج کی وجہ سے یہ جماعت خارجی کے نام سے مشہور ہوئی ۔ یہ لوگ کوفہ سے نکل کر جسر نہروان پر جمع ہوئے ۔ وہاں سے بصرہ وغیرہ دوسرے مقامات میں بھی اپنے خروج کی اطلاع بھیجی ۔

ثالثوں نے حضرت علی کو خلافت سے معزول کیا ۔ حضرت علیؓ نے اس کو قرآن کے خلاف قرار دے کر کوفیوں کو حکم دیا کہ شام کی روانگی کے لئے تیار ہو جائیں ۔ خوارج کو بھی لکھا کہ آکر جماعت میں شامل ہو جاؤ ۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کو امام نہیں مانتے اس لئے ان کی طرف سے مایوسی ہو گئی ۔ چاہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر شام کی طرف لشکر کشی کریں ۔ باہر نکل کر نخیلہ میں خیمہ زن ہوئے وہاں خبر ملی کہ خوارج لوگوں کو اس فوج میں شریک ہونے سے روکتے ہیں اور کئی آدمیوں کو انھوں نے قتل بھی کر ڈالا ہے حضرت علیؓ نے ان کے پاس قاصد بھیجا اس کو بھی مار ڈالا ۔ امراء فوج نے کہا کہ اگر ان کو یہاں چھوڑ کر ہم شام کی طرف روانہ ہو جائیں گے تو یہ ہمارے گھروں کو لوٹ لینگے ۔ لہذا بہتر ہے کہ پہلے ان کا فیصلہ کر دیا جائے حضرت علیؓ نے ان کی رائے کو مناسب سمجھ کر اسی طرف رُخ کیا ۔ وہاں پہنچ کر ان سے کہا کہ تمھاری جماعت کے جن لوگوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے ان کو ہمارے سپرد کر دو ۔ اس پر خارجی یک زبان ہو کر بولے کہ ہم سب نے ان کو قتل کیا ہے اور ہم سب ان کے خون کو حلال سمجھتے ہیں حضرت علیؓ نے ہر چند ان کو نصیحت کی مگر کچھ اثر نہ ہوا ۔ آخر حضرت ابوایوب انصاری کو حکم دیا کہ امان کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں پھر اعلان کرا دیا کہ سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے جو شخص اس جھنڈے کے نیچے آجائے گا یا کوفہ وغیرہ کسی آبادی کی طرف چلا جائے گا اس کو امان ہے ۔ خارجیوں میں سے بہت سے لوگ جھنڈے کے نیچے آگئے اور کچھ کوفہ میں داخل ہو گئے ۔ ابن وہب کے ساتھ صرف ۲۸۰۰ آدمی رہ گئے ۔ ان سے جنگ ہوئی جس میں تقریباً وہ سب کے سب مارے گئے ۔ چار سو زخمی جو میدان جنگ میں پڑے تھے ان کو حضرت علیؓ نے اٹھوا کر ان کے رشتہ داروں کے سپرد کیا کہ کوفہ میں لے جا کر علاج کرائیں ۔

اس کے بعد حضرت علیؓ نے شام کی روانگی کی تیاری شروع کی اور اہل کوفہ کو چلنے کا حکم دیا ۔ روزانہ پرجوش خطبے سنا سنا کر جہاد کے لئے ان کو آمادہ کرتے مگر وہ اپنے

گھروں میں جاکر بیٹھ رہے۔ بالآخر مایوس ہوکر ان کو اس مہم کا ارادہ ترک کردینا پڑا۔

خوارج پہلے ہی ان کی خلافت کا انکار کرچکے تھے۔ نہروان کی لڑائی نے ان کے دلوں میں ان کی طرف سے اور بھی نفرت پیدا کردی۔ ان وجوہات سے انھیں میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی نے جس کی بیوی کے بہت سے رشتہ دار نہروان میں مارے گئے تھے ان کو خنجر مارا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔

خوارج اور امیر معاویہ

یہ جماعت جس نے ثالث ماننے پر حضرت علی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ امیر معاویہ کی حکومت کو جو تغلب پر مبنی تھی کیونکر جائز سمجھتی۔ چنانچہ پوری قوت سے ان کے مقابلے کے لئے کھڑی ہوگئی۔ کوفہ میں امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتے ہی فردہ بن نوفل اشجعی پانسو خارجیوں کے ساتھ علانیہ مخالفت کے لئے نکلا اور نخیلہ میں خیمہ زن ہوا۔ اس کے مقابلے کے لئے شامیوں کی فوج کا ایک دستہ آیا جو شکست کھاگیا۔ امیر معاویہ نے روٴسا کوفہ سے کہا کہ یہ لوگ تمھارے ہی خاندان اور قبیلے کے ہیں جاکر ان کو سمجھاؤ کہ کیوں امت میں خونریزی کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے جاکر بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانے اور کہنے لگے کہ معاویہ ہمارے اور تمھارے سب کے دشمن ہیں۔ ہم کو ان کے ساتھ لڑنے دو۔ اگر ہم نے شکست دیدی تو متفقہ دشمن تباہ ہوا نہیں تو ہم خود فنا ہوجائیں گے۔ قبیلہ اشجع نے فردہ کو پکڑ کر زبردستی باندھ لیا اور اپنے ساتھ کوفہ میں لائے۔ خوارج نے اس کی جگہ عبداللہ بن ابی الحوسا کو اپنا سردار بنالیا۔ کوفیوں کے مقابلہ میں وہ مارا گیا۔ اب حوثرہ اسدی کو انھوں نے اپنا امیر بنایا امیر معاویہ نے حوثرہ کے باپ سے کہا کہ جاکر اپنے بیٹے کو سمجھاؤ۔ وہ گئے مگر ان کی باتوں کا حوثرہ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بولے کہ اب میں تیرے بچے کو لاتا ہوں جب تو اس کو دیکھے گا تو اس کی محبت کی وجہ سے اس بغاوت سے باز آجائے گا۔ حوثرہ نے کہا کہ میں اپنے بچے کی بہ نسبت راہ حق میں اس نیزہ کی انی کا زیادہ شائق ہوں جو میرے جگر سے پار

ہوجائے اور جس کے زخم سے تڑپ تڑپ کر جان دیدوں۔ انھوں نے یہ کیفیت امیر معاویہ کو آکر سنائی۔ امیر معاویہ نے کوفہ سے ایک فوج گراں ان کے مقابلے کے لئے بھیجی۔ حوثرہ نے کہا کہ ظالمو! کل تک تم معاویہ کو باغی سمجھ کر ان کے خلاف جنگ کرتے تھے اور آج ان کی خلافت قائم کرنے کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔ حوثرہ کے مقابلے میں خود اس کے باپ گئے اس نے ان کی طرف سے منہ موڑ کر دوسرے کوفیوں پر حملہ کیا۔ بنی طے کے ایک شخص نے اس کو قتل کر دیا۔ مگر جب اس کی پیشانی پر سجدہ کا گہرا داغ دیکھا تو بہت پچھتایا۔

خوارج کی جماعتیں اسی طرح سلسلے وار نکلنے لگیں۔ یہاں تک کہ عراق پر ان کا خوف چھا گیا۔ امیر معاویہ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس صوبے میں کار آزمودہ مدبروں کو والی مقرر کریں جو حسن سیاست سے ان کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ اور زیاد کو بصرہ کے لئے نامزد کیا۔

خوارج اور بنی مروان

خوارج کا زور برابر بڑھتا گیا لیکن باہمی اختلاف کی وجہ سے ان کی دو جماعتیں ہو گئیں ایک عراق میں رہی جس کا مرکز بصرہ کے علاقے میں مقام بطائح تھا۔ انھوں نے کرمان سے فارس اور اہواز تک قبضہ کر لیا تھا۔ بصرہ پر بھی ان کا خوف غالب تھا۔ ان کے نامی امرا میں سے نافع بن الازرق اور قطری بن الفجاۃ تھے۔

دوسری جماعت یمامہ سے حضرموت۔ یمن اور طائف تک مستولی تھی۔ ان کے مشہور سرداروں میں سے ابو طالوت نجدہ بن عامر اور ابو فدیک گزرے ہیں۔

مہلب بن ابی صفرہ

نافع بن ازرق تمام خوارج میں سخت تر تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جو لوگ دین کی مدد کے لئے تلوار لے کر کھڑے ہو جائیں صرف وہی مسلمان ہیں اور باقی سب کافر۔ فتنہ سے کنارہ کشی کے بہانے سے الگ بیٹھ جانا اور تیغ بکف ہو کر دین کی خدمت کے لیے نہ نکلنا کفر ہے۔ اس وجہ سے وہ اور اس کی جماعت

جہاد۔ جانفروشی اور شجاعت میں انتہائی حد پر تھے۔ اُنھوں نے بصرہ کے قریب تک قبضہ کر لیا۔ اہل بصرہ میں سخت پریشانی پھیل گئی۔ وہاں کے اہل الرائے اور رؤسا جمع ہو کر مہلّب بن ابی صفرہ کے پاس گئے جو اموی فوج کا ایک نامور سپہ سالار تھا اور کہا کہ خوارج کی مہم بلا تمھارے سر نہیں ہو سکتی۔ اس نے چند شرطوں کے ساتھ ان کی درخواست قبول کر لی۔ اور خوارج کے مقابلے کے لئے آیا۔ مروانی سلطنت کی پوری طاقت اس کے پس پشت تھی۔ جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا اور کسی فریق کو شکست نہیں ہوئی جب حجّاج بن یوسف عراق کا والی ہوا تو اس نے خلیفہ کے حکم سے کوفہ اور بصرہ سے مہلّب کے لئے مسلسل کمک بھیجنی شروع کی۔ سالہا سال گزر گئے لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکا۔ تنگ آکر حجاج نے براء بن قبیصہ کو لشکر گراں کے ساتھ مدد کے لئے بھیجا اور مہلّب کو لکھا کہ اس مہم کو جلد ختم کرنا چاہئے مہلّب ساری فوج لے کر خارجیوں کے مقابلے میں صف آرا ہوا۔ اپنے ساتوں بیٹوں کو ایک ایک دستہ کا امیر بنایا۔ خود ایک ٹیلے پر بیٹھ کر احکام دیتا تھا۔ سخت معرکہ آرائی ہوئی رات کو فوجیں واپس آئیں۔ براء نے کہا کہ تمھارے بیٹوں جیسے بہادر اور تمھارے سواروں جیسے سوار میں نے آج تک نہیں دیکھے اور نہ اس قسم کی سخت لڑائی میری نظر سے گزری۔ لیکن فتح آسمان سے اُترتی ہے انسان کی کوشش پر موقوف نہیں ہے۔ اس نے وہاں سے واپس آکر حجاج کو ساری کیفیت سنائی اور کہا کہ نہ مہلّب کا قصور ہے نہ فوج کا بلکہ خوارج کی جماعت نہایت جانباز اور سر فروش ہے۔ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔

آخر مہلّب ان کو مغلوب نہیں کر سکا۔ لیکن خود خوارج میں ایک خون کے معاملے میں اختلاف پڑ گیا جس کی وجہ سے ان میں دو جماعتیں ہو گئیں اور آپس میں لڑنے لگیں۔ حجّاج چاہتا تھا کہ اسی حالت میں ان پر حملہ کر دیا جائے لیکن مہلّب خاموش رہا۔ جب دونوں فریق خوب لڑ چکے اور قطری اپنے ساتھیوں کو لے کر طبرستان کی طرف چلا گیا اس وقت مہلّب نے عبد ربہ کی جماعت کی طرف اپنی فوج بڑھائی اور ان سب کو قتل کر دیا۔

اس فتح کے بعد بصرے میں آیا۔ حجاج نے عظیم الشان دربار کیا۔ اس کو اپنے برابر مسند پر بٹھایا۔ شعراء نے اس کی مدح میں قصیدے پڑھے جن لوگوں نے ان لڑائیوں میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے ان کو انعامات دئے گئے اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔

اب قطری کے پیچھے طبرستان میں فوجیں بھیجی گئیں۔ وہ ایک ٹیلے پر چڑھتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوگیا اور اس کے بھی تمام ساتھی مقتول ہوگئے جس سے خوارج کا یہ فرقہ جو نافع بن ازرق کی پیروی کی وجہ سے ازارقہ کہا جاتا ہے ختم ہوگیا۔ یہ واقعہ ۷۷ھ کا ہے۔

دوسرے فرقہ کے خوارج میں صالح اور شبیب نے ۷۶ھ میں سرزمین موصل میں سر اٹھایا۔ حجاج ان کی سرکوبی کے لئے بھی فوجیں بھیجتا رہا جن کو وہ برابر شکست دیتے رہے۔ یہانتک کہ شبیب ایک بار جرأت کرکے کوفہ میں گھس آیا۔ کئی دن وہاں رہا اور باشندوں پر سختیاں کیں۔ حجاج نے امراء و رؤسائے قبائل کو جمع کرکے مقابلے کی تیاری کی۔ خوارج باہر نکل گئے ان کی تعداد صرف ایک ہزار تھی مگر پچاس ہزار عراقی فوجوں کو جو ان کے مقابلے کے لئے بڑھی تھیں شکست دیدی اور پھر کوفہ میں آگئے یہاں چار ہزار شامی فوج تھی جس نے ان کو نیزوں پر رکھ لیا اور سب کو ختم کردیا۔

خارجیوں کے نزدیک حکومت الٰہی کے سوا انسانی حکومت کو تسلیم کرنا کفر تھا اس وجہ سے مغلوب ہو جانے کی صورت میں بجز قتل ہو جانے کے ان کے لئے کوئی اور سبیل نہ تھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں خارجیوں نے ان سے جاکر بحث کی۔ گو ان کو عادل دیکھ کر مقابلے کے لئے نہیں کھڑے ہوئے مگر ان کی جماعت بدستور اطاعت سے خارج رہی۔ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی کے زمانے میں عراق میں پھر انھوں

نے سر اٹھایا، اور ان کے سردار ضحاک نے موقع دیکھ کر موصل پر چڑھائی کر دی۔ والیان صوبہ اس کے مقابلے سے عاجز رہے۔ خلیفہ کا بیٹا عبداللہ نصیبین کا حاکم تھا۔ ضحاک نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس کی جماعت میں ایک لاکھ آدمی تھے۔ اس لئے مروان خود اپنی کل فوج لے کر مقابلے کے لئے آیا۔ ضحاک مقتول ہوا۔ خوارج نے سعید بن بہدل کو اپنا امیر بنا لیا۔ اس نے شامی لشکر پر اس بے جگری سے حملہ کیا کہ قلب کو توڑتا ہوا خود مروان کے خیمے تک پہنچ گیا۔ مگر وہاں مارا گیا۔ مروان اور اس کے امرا، اس جماعت کے ساتھ برابر جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۰ھ میں ان کا خاتمہ ہوا۔ اسی زمانے میں یمامہ اور حضرموت کے خارجیوں کو بھی اموی فوجوں نے شکستیں دیں۔

خوارج اور بنی عباس

بنی امیہ اور خاص کر مہلب اور مروان نے خارجیوں کی طاقت اگرچہ بہت کچھ توڑ دی تھی لیکن پھر بھی انھوں نے عباسیوں کے مقابلے میں وہی جوش و خروش دکھایا۔ ۱۳۴ھ میں عمان میں جلندی ایک جماعت لے کر اٹھا۔ سفاح نے بحری فوج خازم بن خزیمہ کی ماتحتی میں بھیجی جس نے متعدد لڑائیوں کے بعد اس کو شکست دی۔ دس ہزار خارجی مقتول ہوئے۔ منصور کے عہد میں الجزیرہ میں شیبانی مقابلے کے لئے کھڑا ہوا۔ خلافت کی طرف سے فوج پر فوج بھیجی جاتی تھی اور وہ سب کو شکست دیدیتا تھا۔ آخر منصور نے بھی خازم ہی کو ان کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ وہ مرو رود کے علاقہ کے آٹھ لاکھ آدمی لے کر آیا اور ۱۳۸ھ میں ان کو فنا کیا۔

افریقہ تونس میں خوارج کی صفریہ اور اباضیہ جماعت نے بغاوت برپا کر رکھی تھی جن کے ساتھ کثیر تعداد میں بربر بھی شامل ہوگئے تھے اور قیروان پر قبضہ کر لیا تھا۔ منصور نے یزید بن حاتم کو اس مہم کے لئے منتخب کیا کہ وہ اپنے چچا مہلب کی طرح ان کو فنا کرے۔ یزید ان کے ساتھ پورے پندرہ سال تک لڑتا رہا جن میں ۳۰۰ معرکے ہوئے۔ آخر

میں ان کو مٹا کر چھوڑا۔

مہدی کے زمانے میں بھی یہ جماعت لڑتی رہی۔ آخری کوشش ہارون کے زمانہ میں ولید بن طریف شیبانی کی تھی جو نامور شجاع تھا۔ ہارون نے اسکے مقابلے کے لئے بار بار فوجیں بھیجیں وہ سب کو شکست دیتا رہا جن کے باعث جزیرہ سے لیکر آرمینیہ تک اس کا اقتدار بڑھ گیا۔ اس لئے ہارون نے ایک کارآزمودہ سپہدار یزید شیبانی کو اس مہم پر بھیجا۔ اس کو بھی کئی مہینے لگ گئے بر امکہ نے جو اس سے رنجش رکھتے تھے خلیفہ کے کان بھرنے شروع کئے کہ یہ بھی شیبانی وہ بھی شیبانی دونوں باہم ساز باز نہ کرلیں۔ ہارون نے تہدید آمیز حکم بھیجا۔ یزید نے پوری طاقت سے حملہ کیا۔ ولید مارا گیا اور اس کی جماعت مقتول ہوئی۔ اس کے بعد خوارج پھر اُٹھنے کے قابل نہ رہے اور ان کی اجتماعی قوت ختم ہوگئی۔ اب جبکہ امت میں کوئی جماعت "لا حکم الا اللہ" کہنے والی باقی نہیں رہ گئی استبداد نے اطمینان کا سانس لیا لیکن نتائج دور نہ تھے

خارجی مذہب

اس جماعت کی پیدائش کا بنیادی نقطہ "لاحکم الا اللہ" ہے یعنی کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ صفین کے میدان میں جب ثالثی نامے کی مخالفت ہونے لگی اس وقت کسی نے یہی نعرہ لگا دیا جو بجلی کی سرعت کے ساتھ پھیل گیا کیونکہ اس میں ان کے مافی الضمیر کی پوری ترجمانی تھی چنانچہ یہی کلمہ ان کا شعار ہوگیا۔ وہ جب کوئی مجمع کرتے یا ان کے جلسوں میں کوئی تقریر ہوتی تو آخر میں یہی نعرہ لگاتے اس لئے یہ فرقہ خالص سیاسی ہے۔ عام مسلمانوں سے اس کا اختلاف صرف خلافت کے چند مسائل میں ہے۔

ان کے نزدیک صحت خلافت کی شرط جمہور مسلمانوں کا آزاد انتخاب ہے قرشیت کی کوئی قید نہیں۔ حبشی غلام بھی اگر منتخب ہوجائے تو اس کی اطاعت واجب ہے حضرت ابوبکر و عمر کے انتخاب کو جمہوری اور ان کی خلافتوں کو صحیح سمجھتے تھے۔ نیز حضرت عثمان

کی خلافت کو بھی ابتدائی چھ سال تک ۔ مگر جب سے وہ بنی امیہ کی رائے میں آ گئے اور شیخین کے طریقے پر نہیں رہے ان کا عزل واجب تھا حضرت علی کی خلافت کو بھی صحیح مانتے تھے مگر جب سے ثالثی نامہ لکھا اس وقت سے ان کی رائے میں کافر ہو گئے ۔ اصحاب جمل حضرت طلحہ و زبیر وغیرہ کو اس بنا پر کہ خلیفہ برحق حضرت علی سے لڑے نیز ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کو بھی کافر قرار دیتے تھے ۔ غرض ان کا سارا اختلاف "حکومت الٰہی" کے محور پر گھومتا تھا اور اسی نقطہ پر وہ تمام امت سے الگ ہو گئے تھے ۔

کلمۂ حق

مورخوں کا بیان ہے کہ حضرت علی نے جب ان کے نعرہ "لا حکم الا للہ" کو سنا تو فرمایا کہ "کلمۃ حق ارید بہا الباطل" یعنی بات تو سچی ہے لیکن اس کا جو مطلب لیا گیا ہے وہ باطل ہے ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی امیر نہیں حالانکہ انسانوں پر کسی انسان کا امیر ہونا لازمی ہے جو نظام کو قائم رکھے ۔

میرے نزدیک اس قول کی نسبت حضرت علی کی طرف صحیح نہیں ہے ۔ کیونکہ خوارج خود ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اس لئے وہ جانتے تھے کہ یہ انسان کی امارت کے منکر نہیں ہیں بشرطیکہ اس کی امارت قرآن کے مطابق ہو ۔ لہٰذا ان کے کلمہ کی یہ تاویل جو بداہتاً غلط تھی حضرت علی کر ہی نہیں سکتے تھے ۔

اصلیت یہ ہے کہ خوارج کی جماعت کل اُمت کے خلاف تھی ۔ اس لئے مخالف فرقوں نے ان کو بدنام کرنے کے لئے جہاں جہاں موقع پایا جھوٹی روایتیں گھڑ لیں ۔ ان کا سب سے بڑا حریف مہلب بن ابی صفرہ تھا ۔ وہ تلوار سے بھی لڑتا تھا اور ان کی مذمت میں جھوٹی حدیثیں بھی گھڑتا تھا ۔ اس کے کذب کی اس قدر شہرت تھی کہ بنی ازد کے لوگ جب اس کو دیکھتے تو کہتے ۔

انت الفتیٰ کل الفتیٰ	لو کنت تصدق ما تقول
تو بہادر ۔ بڑا بہادر	جو تیری باتیں بھی سچی ہوتیں

علاوہ بریں خود حضرت علی نے اپنے آخری ایام میں وصیت فرمائی
لاتقاتلوا الخوارج بعدی فلیس من طلب الحق فاخطاہ کمن طلب الباطل فادرکہ یعنی میرے بعد خوارج سے جنگ نہ کرنا جو حق کا طالب ہو گو اس کو حاصل نہ کر سکے اس سے بہتر ہے جو باطل کا طلبگار ہوا اور اس کو حاصل کرلے۔
اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت علی خوارج کو حق کا طالب سمجھتے تھے اور شامیوں کو باطل پرست۔

خوارج کے فرقے

اس جماعت کی ابتدائی مخالفت مسئلہ خلافت ہی تک محدود تھی مگر بعد میں بعض دیگر مسائل کا اضافہ ہوا جن میں جزوی اختلافات کے باعث اس کے بیس فرقے ہو گئے۔ سب سے بڑا فرقہ نافع بن ازرق کا تھا جو اس کے نام کی نسبت سے ازارقہ مشہور ہوا۔ یہ لوگ شرعی اعمال نماز۔ روزہ۔ صدق اور عدل وغیرہ کو بھی ایمان کا جزو قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی شخص اللہ و رسول کو دل سے مان کر اور زبان سے اقرار کر لینے پر بھی کافر ہے اگر ان کے احکام پر عمل نہ کرے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر مطلق سمجھتے تھے نیز اپنے سوا تمام مسلمانوں کو جو انسانی حکومت پر راضی ہو گئے تھے کافر قرار دیتے تھے جن کے ساتھ نہ مناکحت جائز تھی نہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال۔ ظالم سلاطین کے مقابلے کے لئے قوت کا اندازہ کئے بغیر تلوار لے کر اٹھ جانا فرض سمجھتے تھے۔ جو کوئی باوجود قدرت کے ایسا نہ کرے خواہ انھیں کی جماعت کا کیوں نہ ہو کافر ہے۔
دوسرا گروہ نجدہ بن عامر کا تھا۔ یہ جہالت کو عذر قرار دیتا تھا اور اجتہاد میں کسی سے غلطی ہو جائے تو اس کو معذور سمجھتا تھا۔ ان امور میں نافع کے ساتھ اس کے مناظرے بھی ہوئے
تیسری جماعت اباضیہ تھی جو عبداللہ بن اباض تمیمی کی پیرو تھی۔ یہ لوگ ازارقہ

کے مقابلے میں بہت نرم تھے۔ دعوت و اتمام حجت کے بغیر مخالفوں پر اچانک حملہ جائز نہیں سمجھتے تھے نہ دیگر مسلمانوں کو عرب جاہلیت کے بت پرستوں کی طرح قرار دیتے تھے۔ غالباً اسی صلح پسندی کی وجہ سے ان کے نام لیوا آج بھی شمالی افریقہ۔ سواحل عمان۔ حضر موت اور زنجبار میں پائے جاتے ہیں۔ اس نرمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن اباض عہد عباسی میں پیدا ہوا تھا جب کہ خوارج کی قوت ٹوٹ چکی تھی اور صرف مذہبی حرکت باقی رہ گئی تھی ۔

عبداللہ بن صفار رئیس خوارج کے پیرو جو صفریہ کہے جاتے تھے ان لوگوں کو بھی برا نہیں سمجھتے تھے جو فتنہ سے الگ ہو کر بیٹھ جائیں۔ چنانچہ یہ ساری جماعت خانہ نشین ہو کر اُمت میں جذب ہو گئی۔

خوارج کے صفات

خوارج عقائد اور فرائض دونوں میں متشدد تھے اور عبادت میں سخت انہماک رکھتے تھے۔ شہرستانی نے ان کی جماعت کے متعلق لکھا ہے کہ اہل صوم و صلوٰۃ ہیں۔ شب بیداری ان میں عام تھی زیاد نے ایک خارجی کو قتل کیا پھر اس کے غلام سے اس کی کیفیت پوچھی۔ اس نے کہا کہ میں نے اس کے لئے نہ کبھی رات میں بستر بچھایا نہ دن میں کھانا لگایا۔ یعنی وہ قائم اللیل اور صائم النہار تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کو جب حضرت علی نے خوارج کے ساتھ مناظرے کے لئے بھیجا تو وہ ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے داغ اور ان کے چہروں پر عبادت کا نور دیکھ کر بہت متاثر ہو گئے۔

جھوٹ کو ان کا ہر فرقہ زنا و شراب سے بھی بدتر جانتا تھا۔ اور تقیہ کو بجز اس خاص صورت کے جس میں قرآن نے اس کو مباح کیا ہے حرام سمجھتا تھا۔ بغدادی نے اپنی کتاب "اصول الدین" میں لکھا ہے کہ "خوارج کے ایمان و عمل کی بنیاد خالص قرآن پر تھی۔ روایات کو دین نہیں مانتے تھے۔"

ان کے نزدیک مخالفوں سے جہاد کرنا نجات کا بہترین ذریعہ اور دین کا اہم ترین فریضہ تھا جس میں ان کی عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ وہ غیر قرآنی حکومت کو مٹانا لازمی سمجھتے تھے اور اس میں جانی و مالی کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ دشمن کے مقابلے سے روگردانی ان کے نزدیک کفر تھی۔

لہو ولعب کو کسی حالت میں جائز نہیں رکھتے تھے اور نہ تمسخر و مذاق کو۔ یہاں تک کہ ان کے اشعار بلکہ غزلوں میں بھی وہی دینی حمیت اور جہاد کے حماسی جذبات ہیں جن میں وہ پرورش پاتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں صرف تقوی تھا اور دین۔ اور انھیں کی مدافعت میں سربکف رہتے تھے۔

اُن لوگوں کو انسانیت سے گرا ہوا سمجھتے تھے جنھوں نے دنیاوی مال وجاہ کے لئے اپنی حریتِ ضمیر کو نام نہاد خلفار کے ہاتھ فروخت کر رکھا تھا۔ اور انسانی حکومت پر راضی ہو گئے تھے۔

خلفار اور امرار کے درباروں میں بھی دعوت و تبلیغ کے لئے برابر اپنے وفود بھیجتے تھے اور ان کی دولت وحشمت سے ذرا بھی متاثر نہ تھے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کی گفتگو سن کر فرمایا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم دنیا یا دولت کی طلب کے لئے نہیں نکلے ہو تمھارا مقصود آخرت ہے۔ مگر تم نے راستہ غلط اختیار کیا۔"

ان کی ساری تاریخ شجاعت سے مزین ہے اور ان کے جنگی کارنامے بے نظیر ہیں شبیب خارجی ایک ہزار آدمیوں سے کوفہ کی پچاس ہزار فوج کو شکست دے کر شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ ابن زیاد نے ابو بلال خارجی کے مقابلے کے لئے ابن زرعہ کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھیجا تھا۔ مقام آسک میں جنگ ہوئی جس میں صرف چالیس خارجیوں نے ان دو ہزار کو مار بھگایا۔ اس پر ایک خارجی شاعر نے کہا۔

أألفا مؤمن فی ما زعمتم ويهزمهم بآسک اربعونا
كذبتم ليس ذاک كما زعمتم ولكن الخوارج مؤمنونا

یعنی تمہارے گمان کے مطابق وہ دو ہزار مومن تھے جن کو آسک میں چالیس آدمیوں نے شکست دیدی۔ دراصل تمہارا گمان ہی غلط ہے خوارج ہی مومن ہیں۔" اس واقعہ کے بعد ابن زرعہ جب کوفہ کے بازاروں میں یا سڑکوں پر نکلتا تو بچے اس کا مذاق اڑانے کے لئے آوازے کستے کہ "وہ تمہارے پیچھے ابو بلال آرہا ہے۔"

خوارج کے دلوں میں خلوص تھا اور زبانوں میں صداقت، اسی وجہ سے ان کی باتیں صاف۔ بے لاگ اور پُراثر ہوتی تھیں اور ان کے فقرے دلوں تک نفوذ کرتے تھے۔ ابن زیاد نے ان سے قید خانے بھر رکھے تھے اور کسی کو چھوڑتا نہ تھا۔ کہتا تھا کہ ان کے خطبے ان آتشیں شعلوں کے مانند ہیں جو نیستان میں آگ لگا دیتے ہیں۔

عبدالملک بن مروان کے سامنے ایک خارجی لایا گیا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ اس میں عقل و فہم ہے۔ سمجھانے لگا کہ خروج سے باز آجاؤ۔ خارجی نے اپنے عقائد و خیالات اس فصاحت اور خوبی سے بیان کئے کہ عبدالملک نے کہا کہ میں خیال کرنے لگا کہ جنت انھیں لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے اور جو جہاد یہ کرتے ہیں وہ خود ہمارا فریضہ ہے۔

ابو حمزہ خارجی نے اپنی جماعت کے وصف میں لکھا ہے۔

"وہ جوانی میں بزرگانہ صفات رکھتے ہیں۔ برائی کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ باطل کی سمت قدم نہیں اٹھاتے۔ عبادت گزار اور شب زندہ دار۔ راتوں کی تاریکی میں اللہ ان کو دیکھتا ہے کہ سر نیچا کئے ہوئے اس کے کلام کی تلاوت کر رہے ہیں جنت کا بیان آتا ہے تو شوق میں رو پڑتے ہیں اور جہنم کے ذکر پر خوف سے کانپنے لگتے ہیں گویا کہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ سجدوں کی کثرت سے ان کے گھٹنوں۔ ہتھیلیوں ناکوں

اور پیشانیوں پر گھٹے پڑ گئے ہیں۔ پھر جب کمانیں کھنچتی ہیں۔ نیزے نکلتے ہیں۔ تلواریں چمکتی ہیں اور میدان جنگ میں سپاہیوں کے نعروں سے موت کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اس وقت بلا خطر آگے بڑھتے ہیں، مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔ گھوڑوں سے گرتے ہیں خون میں لتھڑے ہوئے۔ درندے ان کی وہ کلائیاں چباتے ہیں جن پر ٹیکے لگا کر مدتوں وہ اپنے رب کو سجدے کرتے رہے اور پرندے ان کی وہ آنکھیں نکالتے ہیں جو شب ہائے دراز کی تاریکیوں میں اللہ کے خوف سے آنسو بہایا کرتی تھیں۔"

جماعتِ خوارج

خوارج جو دعوے لیکر کھڑے ہوتے تھے یعنی "لاحکم الا اللہ" وہ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم ہے اور جس زمانے میں ان کا ظہور ہوا اس زمانے میں صحابہ اچھی تعداد میں موجود تھے مگر بجز حضرت انس بن مالک کے جو مدینے میں رسول اللہ کے خادم تھے اور بصرہ آباد ہونے کے بعد اس میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی اور کسی صحابی کا نام ان کی جماعت میں نہیں ملتا۔ میرے خیال میں اس کے حسب ذیل وجوہ ہو سکتے ہیں۔

(۱) ان کا خروج سب سے پہلے حضرت علی کے مقابلے میں ہوا جن کے عالیشان رتبے سے سب واقف تھے۔ ان کو چھوڑ کر خارجیوں کا ساتھ کیسے دیتے۔

(۲) صحابہ جماعت کا ساتھ چھوڑنا جائز بھی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب یزید کی بیعت ہوئی اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ ابن عباس نے جو باوجود اس کے کہ پہلے سے اس کے خلاف تھے بیعت کر لی اور جماعت سے الگ ہونا گوارا نہ کیا۔

(۳) خوارج میں انھوں نے بد دنیت۔ قساوت اور کوتاہ نظری دیکھی۔ اس لئے ان کے ساتھ شامل ہونا پسند نہ کیا۔

(۴) خوارج فنا ہو گئے اور ان کی تاریخ مرتب نہ ہو سکی۔ ادبار میں سے مبرّد نے
نے الکامل میں اور ابن ابی الحدید شیعی نے شرح نہج البلاغۃ میں اگر ان کے کچھ حالات نہ لکھدئے
ہوتے تو ہم تک صرف ان کا نام ہی نام پہنچتا۔ اس لئے خوارج کی جماعت کے متعلق
ہمارا علم بھی محدود ہے۔ شروع میں اس جماعت میں زیادہ تر وہ عرب شریک ہوئے
جو بصرہ اور کوفہ کی چھاؤنیوں میں تھے۔ ان میں بھی بنی تمیم کی تعداد زیادہ تھی جو سخت جنگجو
تھے اور جن پر سادگی اور بدویت غالب تھی۔ بعد میں اور لوگ بھی شامل ہوتے گئے۔
خاصکر موالی (عجمی نومسلم) جو بنی اُمیہ کے مظالم سے تنگ تھے۔ انھوں نے خوارج میں
آغاز اسلام کی سادگی، اخوت، مساوات اور جمہوریت دیکھی اس وجہ سے ساتھ دیا۔
تابعین میں سے عکرمہ مولٰے ابن عباس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خوارج کے ہم خیال
تھے۔ امام حسن بصری بھی تحکیم کے معاملے میں خوارج کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے۔ وہ جب
اپنی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت علی کا ذکر کرتے تو افسوس کے ساتھ کہتے۔

"فتح و ظفر برابر امیر المومنین کا ساتھ دے رہی تھی یہاں تک کہ انھوں
نے ثالث مان لیا۔ ثالث کیوں مانا تم تو حق پر تھے۔ آگے کیوں نہ بڑھے
حق تو تمھارے ساتھ تھا۔"

عہد عباسی میں بعض نامور علمار بھی ان کے ہم خیال ملتے ہیں۔ ابن خلکان نے ابو
عبیدہ معمر بن مثنّٰے کے متعلق لکھا ہے کہ خارجیوں کے موافق تھے۔ ایسی ہی روایتیں
ابوحاتم سجستانی اور ہیثم بن عدی کے بارے میں ہیں۔ لیکن یہ لوگ صرف نظری حیثیت سے
ان کی بعض باتوں کو صحیح سمجھتے تھے عملی طور پر کبھی ان میں شریک نہیں ہوئے بلکہ خلفار
و امرار کی تابعداری کرتے رہے۔ عقائد نگاروں نے بیشتر انھیں لوگوں کے خیالات
کو خارجیوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ اس نام سے مشہور ہو گئے
تھے۔ حالانکہ خارجیوں کی نظر میں یہ سب کافر ہی تھے۔

تباہی کے اسباب

خوارج کی تاریخ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں نہیں لکھی گئی۔ جو کچھ ان کے بارے میں ملتا ہے علاوہ اس کے کہ بہت تھوڑا ہے غیروں کی زبان سے ہے اور یک طرفہ ہے۔ اس لئے ان کی تباہی کے صحیح اسباب کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ میرے قیاس کے مطابق حسب ذیل وجوہ ہیں۔

(۱) خوارج اپنے عقیدے اور عمل میں نہایت تشدد تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان میں مخالفت ہو جاتی اور الگ الگ جھنڈے کھڑے کر کے آپس ہی میں لڑنے لگتے۔ ۷۵ھ میں جبکہ ازارقہ کے مقابلے میں مہلب پوری طاقت سے سابور میں جما ہوا تھا خارجیوں میں سے ایک نامی شہوار مقعطر نے کسی جھگڑے کی بنیاد پر اپنی ہی جماعت کے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ مقتول کے ورثہ اپنے امیر قطری کے پاس گئے اور کہا کہ قاتل کو قصاص کے لئے ہمارے حوالے کرو۔ اس نے انکار کیا اور کہا کہ مقعطر فاضل اور دین دار شخص ہے اس نے شرعی تاویل کی بنا پر قتل کیا ہے اگر اس کا جرم ثابت ہو سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس نے تاویل میں غلطی کی ہو ایسی حالت میں میں قصاص کو لازم نہیں سمجھتا۔

اس فیصلے کو مدعیوں نے نہیں مانا اور قطری کی بیعت کو فسخ کر کے عبد ربہ الکبیر کو اپنا امیر بنا لیا۔ بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ دونوں جماعتوں میں لڑائی ہونے لگی جو تقریباً ایک مہینے تک جاری رہی۔ آخر میں قطری شکست کھا کر اپنے ساتھیوں کو لئے ہوئے طبرستان کی طرف چلا گیا۔ مہلب نے جو سالہا سال کی کوشش کے باوجود ان کو شکست دینے سے عاجز رہا تھا اب موقع پا کر پہلے عبد ربہ کی جماعت کو قتل کر دیا۔ پھر قطری کے پیچھے فوجیں بھیجیں جنھوں نے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ ایک آدمی کے خون کے جھگڑے میں یہ پوری جماعت جو عظیم الشان طاقت تھی بالکل تباہ ہو گئی۔ اس سے پہلے نجدہ بن عامر کی جماعت بعض معمولی اختلافات پر ان سے الگ ہو کر یمامہ اور حضرموت کی طرف چلی گئی تھی۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے

کہ ان کو قیادت اچھی نہیں ملی یا یہ کہ غیر معمولی دینی حمیت اور جوش تہور کے باعث افراد میں اطاعت کامل نہ تھی ورنہ اگر اس ساری جماعت نے مل کر ہم آہنگی سے کام کیا ہوتا تو بنی امیہ کی خلافت کا قائم رہنا مشکل تھا۔

(۲) ان کی طبیعتوں میں بدویت اور قساوت اس قدر تھی کہ مخالفوں کے بوڑھوں بچوں اور عورتوں کے قتل کو بھی جائز رکھتے تھے اور ان کو عرب جاہلیت کے بت پرستوں کے برابر قرار دیتے تھے جن کے ساتھ کسی قسم کا تعلق حرام تھا جب تک اسلام نہ لائیں جو غیر خارجی ان کو مل جاتا اس کو جان سے مار دیتے۔ ایک بار واصل بن عطاء معتزلہ کا مشہور امام معہ اپنے چند ساتھیوں کے ان کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ جان بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ ان کا عمل ظاہر نصوص پر ہے جس سے بال برابر بھی ہٹنا کفر سمجھتے ہیں اس وجہ سے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی ایک حرف نہ بولے جو کچھ وہ سوالات کریں گے ان کے جوابات میں ہی دوں گا۔ جب خارجیوں نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو۔ اس نے کہا کہ ہم مشرک ہیں آپ کے پاس پناہ لینے آتے ہیں کہ قرآن سنیں۔ انھوں نے قرآنی آیات سنائیں۔ اس نے کہا کہ اب ہم کو ہمارے گھر بھی پہنچا دیجئے کیونکہ قرآن میں ہے:-

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ	اگر کوئی مشرک تیرے پاس پناہ لینے آئے تو اسے پناہ دے تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کے ٹھکانے پر پہنچا دے۔

انھوں نے آدمی ساتھ کر دئے جنھوں نے آبادی تک پہنچا دیا۔

ان کے عدم تفقہ کی بابت مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک کسی یتیم کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقے سے کوئی کھالے تو جہنمی ہے کیونکہ قرآن میں ہے لیکن اگر اس کو مار ڈالے یا اس کا پیٹ چاک کر دے تو جہنمی نہیں ہے اس لئے کہ کوئی آیت اس کی تصریح نہیں کرتی

اسی طرح کسی مشرک کے درخت کا ایک پھل بھی بلا قیمت کھانا حرام تھا مگر اس کو قتل کر دینا حلال۔

(۳) اُنھوں نے اپنے سوا تمام امت کو کافر اور مشرک اور سارے اسلامی خطوں کو دار الحرب قرار دیا اور سب کے مقابلے میں جنگ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ دین و دنیا کی اصلاح کا مدار صرف تلوار پر رکھا اور اسی سے سارے مسائل سلجھانے کی کوشش کی۔ اس لئے ان کی تحریک تعمیری سے زیادہ تخریبی تھی جو کمتر کامیاب ہوا کرتی ہے۔ امت پوری قوت سے ان کو مٹانے کے لئے آمادہ ہو گئی اور بالآخر کم و بیش ڈیڑھ سو سال تک لڑتے بھڑتے اور اسلام کی قوت کو کمزور کرتے ہوئے فنا ہو گئے اور افسوس یہ ہے کہ ان تمام خونریزیوں سے حکومت الٰہی کا عنوان جس کے لئے وہ اُٹھے تھے ذرا بھی رنگیں نہ ہو سکا بلکہ نگاہوں سے اور بھی اوجھل ہو گیا۔ یہاں تک کہ ساری امت کے دل و دماغ پر استبداد ایک حقیقت مسلمہ بن کر چھا گیا۔

شیعہ

شیعہ کا اختلاف بھی جمہور امت سے خلافت ہی کے مسئلہ میں ہے۔ اور یہ فرقہ بھی خوارج کی طرح خالص سیاسی ہے جس پر بعد میں دینی رنگ چڑھا دیا گیا۔

شیعیت کا پہلا تخم صحابہ میں سے وہ جماعت تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتی تھی۔ مثلاً حضرت عباس۔ ابو ذر غفاری مقداد بن اسود۔ عمار بن یاسر اور سلمان فارسی وغیرہ لیکن یہ خیال سادہ تھا جس میں نہ نبی کی طرح امام کی تقدیس شامل تھی نہ اس کے منصوص ہونے کا عقیدہ تھا۔ بلکہ صرف حضرت علی کی محبت عظمت اور قرابت رسول کی خصوصیت کی وجہ سے ان کو خلیفہ دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

لیکن انتخاب حضرت ابوبکر کا ہوگیا اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی نے ان کی بیعت کرلی اور اپنی خلافت کا نہ دعویٰ کیا نہ اپنے حق کی کوئی نص پیش کی۔ اس کے بعد حضرت عمر جب خلیفہ ہوئے تو ان کے ہاتھ پر بھی بیعت کی اور ان کی زندگی بھر ان کے حامی اور مطیع رہے۔ پھر حضرت عثمان کی خلافت کو بھی تسلیم کیا۔

حضرت عثمان خلیفہ ہوجانے کے چند سال بعد اپنے خاندان بنی امیہ کے اثر میں آگئے۔ اور بڑی بڑی ولایات کی حکومتیں ان کو دیدیں۔ جس سے حریفوں کی نگاہوں میں ان کی خلافت کا انداز اموی حکومت کا معلوم ہوا۔ اس وقت مخفی جمعیتیں قائم کی گئیں اور عبداللہ بن سبا کی سازش سے جو صنعا کا یہودی تھا عراق سے لے کر مصر تک ان کے خلاف بغاوت پھیلائی گئی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ان مقامات کے لوگوں نے مدینہ میں آکر حضرت عثمان کو قتل کر ڈالا اور حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس سبائی تحریک میں شیعیت میں وصی کا عقیدہ داخل کیا گیا۔ یعنی مشہور کیا گیا کہ رسول اللہ ؐ نے اپنے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کی وصیت کی ہے۔ اور وہ ان کے وصی ہیں۔

بعد میں اس کی تشریح یہ کی گئی کہ امام جمہور کے انتخاب سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ امامت دین کا رکن ہے اور اُن عام مصالح میں سے نہیں ہے جو امت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے خود نبی کا فریضہ ہوتا ہے کہ اپنے بعد امام کو متعین کر جائے۔ پھر ہر امام دوسرے امام کی تعیین کرتا ہے

اماموں کا انتخاب اللہ کے ہاتھ میں رکھ دینے کی وجہ سے ان کی عصمت کا بھی دعویٰ کیا گیا کہ وہ ہر قسم کے گناہ بلکہ غلطی و خطا سے بھی معصوم ہیں۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر امام منصوص کی معرفت اصول ایمان میں سے قرار دی گئی اور یہی نقطہ مومن اور کافر کے درمیان حد فاصل رکھا گیا۔ پھر یہ تلقین کی گئی کہ یہ امامت صرف حضرت علی اور ان کی اولاد کا حق ہے۔ اس طرح بتدریج خاندانی حکومت کا سیاسی دعویٰ مذہب بنا لیا گیا۔

اس جماعت میں خوارج سے بھی زیادہ فرقے ہوئے کچھ تو دینی مبادی میں اختلافات کی وجہ سے اور کچھ ائمہ کی تعیین میں لیکن اکثر منقرض ہو گئے۔ اب ان کے بڑے فرقے دو باقی رہ گئے ہیں۔ زیدیہ و امامیہ۔

زیدیہ | یہ جماعت امام زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کی پیرو ہے۔ اور شیعہ میں سب سے زیادہ معتدل اور اہل سنت سے قریب تر ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ امام زید رئیس معتزلہ واصل بن عطاء کے شاگرد تھے۔ اور اس کی تعلیم کا اثر ان کے اوپر پڑا تھا۔ وہ فاضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی خلافت کو جائز سمجھتے تھے۔ اس وجہ حضرت علی کو جملہ صحابہ میں افضل مان کر بھی شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ امام کی تعیین کے لئے وحی الٰہی یا نص کے قائل نہ تھے۔ بلکہ بنی فاطمہ میں سے جو بھی عالم۔ زاہد۔ سخی۔ شجاع ہو

اور اہلیت رکھتا ہو اور امامت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہو جائے وہ امام ہے۔

ان کے نزدیک امامت محض نظری شے نہیں تھی بلکہ عملی تھی جس کے لئے خروج لازمی تھا۔ سنہ ۱۲۲ھ میں انھوں نے جب ہشام بن عبد الملک کے مقابلے میں خروج کیا تو شیخین کی خلافت کے قائل ہونے کی وجہ سے شیعہ امامیہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور الگ ہو گئے۔ اور اسی دن سے رافضی کہے جانے لگے۔ آخر وہ مقتول و مصلوب ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ اپنی امامت کا دعویٰ لے کر اٹھے۔ وہ بھی سنہ ۱۲۵ھ میں مارے گئے۔

آج یمن کے مسلمانوں میں بڑی تعداد اس فرقہ کی ہے۔ اہل سنت سے ان کے اختلافات اصول و فروع میں بہت تھوڑے ہیں۔

امامیہ

ان کا نام امامیہ اس لئے رکھا گیا کہ ان کی تمام مذہبی تعلیمات کا مرکزی نقطہ امام ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق ہے نہ صرف اہلیت و صلاحیت کے باعث بلکہ بطریق النص۔ پھر ان کے بعد امامت انھیں کی فاطمی اولاد میں محصور ہے۔ جو یکے بعد دیگرے متعین ہیں۔ اور ان کی معرفت اصول ایمان میں سے ہے۔

ان کے دو فرقے ہیں۔ اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ۔ اسماعیلیہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام سادس جعفر صادق کے بیٹوں میں سے امامت موسیٰ کاظم کی طرف نہیں منتقل ہوئی جیسا کہ اثنا عشریہ کا خیال ہے بلکہ اسماعیل امام ہوئے۔ اسی نسبت سے اس جماعت کا نام اسماعیلی رکھا گیا۔ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ امام کے پاس جب قوت نہ ہو تو وہ مستور رہے اور صرف اس کے دعاۃ تبلیغ کریں چنانچہ ان کے ائمہ برابر مخفی رہے۔ یہاں تک کہ عبد اللہ المہدی توت حاصل کرنے کے بعد ظاہر ہوا۔ اور سنہ ۲۹۵ھ میں اس نے افریقہ میں فاطمی خلافت قائم کی۔ غالباً اسی وجہ سے یہ جماعت باطنی کہی جاتی ہے۔

اثنا عشری بارہ امام کے قائل ہیں جو بسلسلہ حضرت علی سے امام غائب تک

ہیں۔ توضیح کے لئے ان کا مختصر شجرہ لکھ دیتا ہوں۔

۱۔ حضرت علی ابن ابی طالب

- ۲۔ امام حسن متوفی سنہ ۵۰ھ
  - حسن
  - عبد اللہ المحض
  - محمد (نفس زکیہ) — ابراہیم
  - یہ دونوں بھائی خلیفہ منصور پر خروج کر کے مقتول ہوئے۔
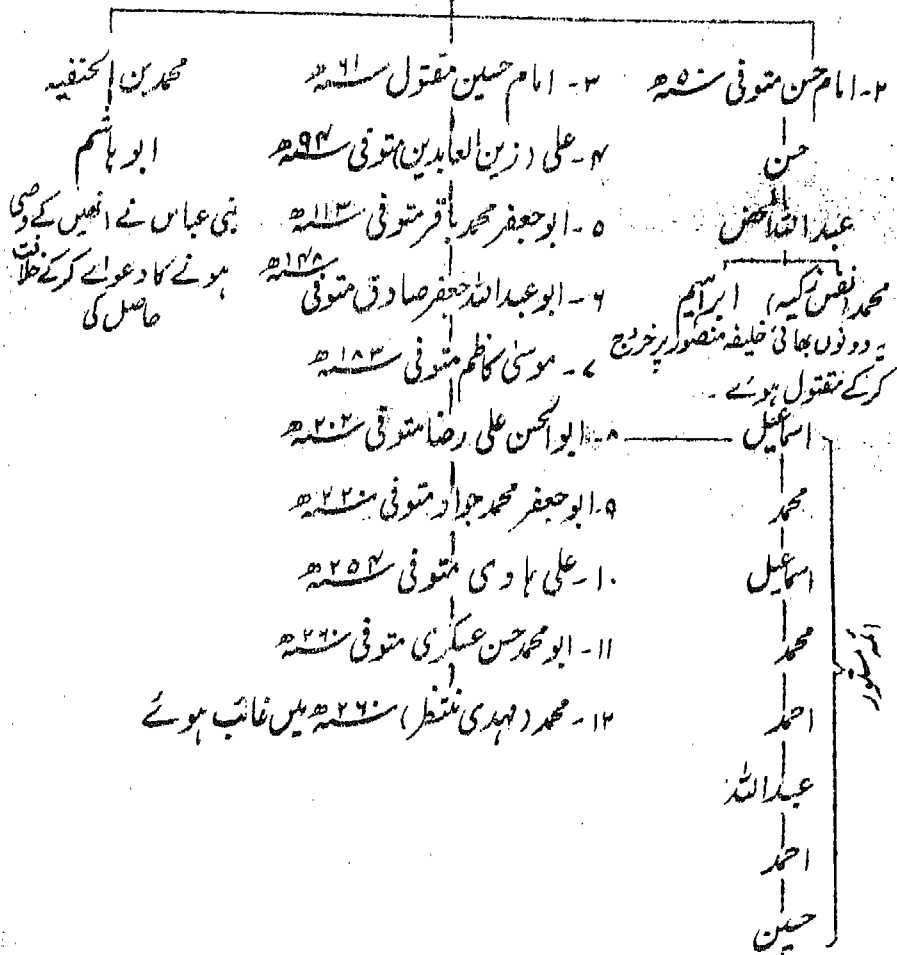
- ۳۔ امام حسین مقتول سنہ ۶۱ھ
- ۴۔ علی (زین العابدین) متوفی سنہ ۹۴ھ
- ۵۔ ابو جعفر محمد باقر متوفی سنہ ۱۱۳ھ
- ۶۔ ابو عبد اللہ جعفر صادق متوفی سنہ ۱۴۸ھ
  - اسماعیل
  - محمد
  - اسماعیل
  - محمد
  - احمد
  - عبد اللہ
  - احمد
  - حسین
  - (ائمہ مستور)
  - عبد اللہ المہدی بانیٔ دولت فاطمیہ متوفی سنہ ۳۲۲ھ
- ۷۔ موسیٰ کاظم متوفی سنہ ۱۸۳ھ
- ۸۔ ابو الحسن علی رضا متوفی سنہ ۲۰۲ھ
- ۹۔ ابو جعفر محمد جواد متوفی سنہ ۲۲۰ھ
- ۱۰۔ علی ہادی متوفی سنہ ۲۵۴ھ
- ۱۱۔ ابو محمد حسن عسکری متوفی سنہ ۲۶۰ھ
- ۱۲۔ محمد (مہدی منتظر) سنہ ۲۶۰ھ میں غائب ہوئے

- محمد بن الحنفیہ
  - ابو ہاشم
  - بنی عباس نے انہیں کے وصی ہونے کا دعوائے کر کے خلافت حاصل کی

منصب امامت

شیعہ کے مخصوص عقائد کا مرکزی نقطہ امام ہے اس لیے یہاں امام کے متعلق اس جماعت کے عقائد کو نہایت اختصار کے ساتھ مذہب شیعہ کی سب سے معتبر کتاب کافی سے التقاط کر کے لکھتا ہوں جو محمد بن یعقوب کلینی بغدادی متوفی سنہ ۳۲۹ھ کی تالیف ہے اور شیعوں میں اس کی صحت و مقبولیت کا وہی درجہ

ہے جو سنیوں میں صحیح بخاری کا ہے۔

ابو حمزہ کہتے ہیں کہ امام جعفر نے فرمایا کہ اللہ کی بندگی وہی کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا وہ یوں ہی گمراہی سے اس کا پرستار بنا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کہ معرفتِ الٰہی کیا ہے؟ فرمایا اللہ عزوجل کی تصدیق حضرت علی کی موالات اور اُن کی پیروی ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی پیروی اور اُن کے دشمنوں سے اللہ کے سامنے برات۔ یہ ہے اللہ کی معرفت۔

امام رضا نے کہا کہ جملہ انسان اطاعت میں ہمارے غلام ہیں اور دین میں ہمارے محب۔

امام ابو جعفر نے فرمایا۔ ہم علم الٰہی کے خزانے دار ہیں اور وحی الٰہی کے ترجمان۔ جو لوگ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہیں ان سب پر ہم اللہ کی حجت ہیں۔

امام رضا سے ایک طویل کلام ائمہ کی توصیف میں مروی ہے جس میں یہ فقرے بھی ہیں۔

امام گناہوں سے پاک اور عیبوں سے بری ہوتا ہے۔ علم کے ساتھ مخصوص اور حلم کے ساتھ موصوف . . . . لوگوں نے سخت غلطی کی اور جھوٹ گھڑا کر جان بوجھ کر اہل بیت کو چھوڑا۔ اور اللہ و رسول کے انتخاب کئے ہوئے سے منہ موڑا۔ نسک و زہد۔ علم و عبادت۔ قدس و طہارت کے معدن۔ رسول کی دعاؤں میں مخصوص اور بتول مطہرہ کی اولاد۔

امام ابو جعفر نے فرمایا "ہم شجر نبوت ہیں اور رحمت کا گھر۔ حکمت کی کنجیاں ہیں اور علم کے معدن۔ رسالت کا موضع ہیں اور ملائکہ کی آمد و رفت کا مقام۔ اللہ کے بندوں کے پاس ہم اس کی امانت ہیں ہم اس کے حرم اکبر ہیں اور ہم اللہ کا ذمہ اور اس کا عہد ہیں۔ جس نے ہمارا عہد پورا کیا

اس نے اللہ کا عہد پورا کیا اور جس نے ہمارا عہد توڑا اُس نے اللہ کا عہد توڑا۔"

"ائمہ کے پاس وہ ساری کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اور وہ ان سب کو باوجود زبانوں کے اختلاف کے سمجھتے ہیں۔ پھر اللہ نے ائمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا جس میں ہر شئے کی تشریح ہے۔ مکمل قرآن سوائے ائمہ کے کسی کے پاس نہیں۔ اور وہ اس کا پورا علم رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے پورا قرآن جمع کرلیا وہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اس کو جس طرح پر وہ نازل ہوا نہ جمع کیا نہ حفظ کیا سوائے علی بن ابی طالب اور اُن ائمہؑ کے جو اُن کے بعد ہیں۔ ائمہ کے پاس اسم اعظم ہے اور وہ جفر بھی رکھتے ہیں جو چمڑے کا ایک تھیلا ہے جس میں انبیاء اور اوصیاء نیز گزشتہ علماء بنی اسرائیل کے علوم ہیں۔ ان کے پاس مصحف فاطمہ ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے اور اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔"

"اللہ عزوجل کے دو علم ہیں۔ ایک وہ جس کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ اور ایک وہ جس کو اس نے ملائکہ اور انبیاء کو سکھلایا۔ اس کو ہم جانتے ہیں۔"

"ائمہ جب کسی شئے کا علم چاہتے ہیں تو اللہ ان کو تبلادیتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کب مریں گے اور جب مرتے ہیں تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔"

"جو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے ائمہ سب کا علم رکھتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اللہ نے رسول کو کوئی علم نہیں سکھلایا مگر یہ کہ ان کو حکم دیا کہ امیر المومنین علی کو سکھلادیں۔ اس لئے وہ علم میں نبی کے شریک تھے۔ پھر یہ علم ائمہ کو ملا۔"

"اللہ نے ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع

کیا ہے۔ وہ بمنزلہ رسول کے ہیں بجز اس کے کہ نبی نہیں ہیں۔"

"ہر امام اپنے بعد آنے والے امام کو کتابیں، علوم اور اسلحہ سپرد کر دیتا ہے۔ اور ائمہ کوئی کام بلا حکم اور بلا عہد الٰہی نہیں کرتے اور اس کے حکم سے ذرا بھی آگے قدم نہیں بڑھاتے۔"

"اللہ و رسول نے ہر ایک امام کی یکے بعد دیگرے تصریح کر دی ہے ہر امام اپنے بعد کے امام کو امامت سپرد کرتا ہے اور اس کے لئے ایک ملفوف کتاب اور ایک وصیت نامہ چھوڑ جاتا ہے جس میں آدم کی تخلیق سے لے کر فنائے عالم تک جو ضرورتیں پیش آنے والی ہیں سب کا حل ہے۔ امام کے لئے غیبت بھی ہے جب اس کے غیبت کی خبر سنو تو انکار نہ کرو۔ اور بارہویں امام غائب ہیں۔ وہی مہدی ہیں جو روئے زمین کو جب کہ وہ ظلم و ستم سے بھر جائے گی عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔"

"جو شخص امامت کا اہل نہ ہو اور اس کا دعویٰ کر بیٹھے وہ کافر ہے۔"

"امام ابوجعفر سے مروی ہے کہ اللہ نے کہا کہ جو رعیت امام ظالم کی تابع ہوگی جو اللہ کی طرف سے نہ ہو اگرچہ اپنے اعمال میں نیک اور پرہیزگار ہوگی میں اس کو عذاب دوں گا اور جو رعیت اسلام میں امام عادل کی تابع ہوگی جو اللہ کی طرف سے ہو اگرچہ بدکار اور گنہگار ہوگی میں اس سے درگزر کروں گا۔[1]"

"امام کو امام ہی غسل (میت) دیتا ہے۔"

"امام جعفر نے فرمایا "اللہ جب کسی امام کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو عرش کے نیچے سے شربت لے کر اس کو پلاتا ہے۔

[1] اللہ کا یہ قول قرآن میں تو کہیں نہیں ہے۔

وہ چالیس دن تک ماں کے شکم میں کوئی کلام نہیں سنتا جب اس کی پیدائش ہوتی ہے تو وہی فرشتہ جس نے شربت پلایا تھا اس کے دائیں بازو پر آکر لکھتا ہے "وتمت کلمۃ ربک صدقاً وعدلا لامبدل لکلماتہ (تیرے رب کا کلمہ سچائی اور عدل کی رو سے پورا ہے اس کو کوئی بدلنے والا نہیں) جس وقت وہ امام اپنے منصب پر پہنچتا ہے اللہ ہر ملک میں اس کے لئے ایک منارہ کھڑا کر دیتا ہے جس کی روشنی میں وہ تمام بندوں کے کام دیکھتا ہے۔"

"فرشتے اماموں کے گھروں میں آتے ہیں۔ ان کے فرش پر بیٹھتے ہیں۔ اور ان کے پاس خبریں لاتے ہیں۔ لوگوں کے پاس وہی بات حق ہے جو امام کے ذریعے سے ملی ہو۔ اور جو بات امام کے ذریعے سے نہ ملی ہو وہ باطل ہے۔"

"ساری زمین امام ہی کی ہے۔ یہ اہل بیت ہیں جن کو اللہ نے زمین کا وارث بنایا ہے۔"

"مال غنیمت کا خمس چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اللہ۔ رسولؐ قرابت دار۔ یتمی۔ مساکین اور مسافر۔ ان میں سے پہلے تین حصے امام کے ہیں۔ اس لئے امام کا حصہ خمس میں سے نصف یعنی کل مال غنیمت کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔ مال فیئ (غنیمت بلا جنگ) نیز جنگل۔ معدن اور سمندر وغیرہ اکیلے امام کے ہیں۔"

میں نے ائمہ اہل بیت کی تعلیمات اور ان کے دعاوی میں سے یہ تھوڑی سی باتیں لی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اقوال کو وہی تسلیم کر سکتا ہے جو ان ائمہ پر ایمان رکھتا ہو ورنہ یہ سب کے سب خط مستقیم قرآن کے خلاف ہیں اور غالباً اسی احساس کی بنا پر اس قرآن کو جس پر امت ایمان رکھتی ہے ناقص قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے اور

کامل قرآن ائمہ کے پاس محفوظ بتایا گیا ہے۔ پھر اس کے علاوہ مصحف فاطمہ بھی ان کے ہاتھوں میں ہے جو اس قرآن سے تگنا اور تعلیمات کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے۔

یہ دعاوی اگرچہ مذہبی رنگ میں ہیں لیکن اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب کے سب استحقاق خلافت کے سیاسی منصوبے کے اردگرد چکر کاٹ رہے ہیں اور ان کا اصل مقصود صرف اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کرنے کے لئے امت کو ہموار کرنا ہے اور حکومت بھی علی الاطلاق !!

اہل سنت کی نگاہ میں خلیفہ بھی دوسرے انسانوں جیسا انسان ہے۔ انھیں کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ پرورش پاتا ہے اور سیکھتا ہے۔ اس کو دوسرے مسلمانوں پر کوئی فضیلت نہیں سوائے اپنی ذاتی لیاقت کے جس کی وجہ سے اس کا انتخاب ہوا۔ نہ اس پر وحی آتی ہے نہ اس کا تسلط روحانی ہے۔ وہ صرف قانون الٰہی کو نافذ کرنے کا مجاز ہے اور اس پر امت کو احتساب کا حق ہے۔ بلکہ غلط روی پر معزول کر دینے کا بھی۔

اور شیعوں کا امام تو اپنی سرشت و فطرت میں انسانوں سے بالاتر ہے۔ ماں کے پیٹ ہی میں عرش کے نیچے سے شربت کا پیالہ پینے لگتا ہے۔ تشریع کا حق رکھتا ہے اس پر تنقید گمراہی ہے۔ اس کا قول و فعل حق و باطل اور خیر و شر کا معیار ہے۔ وہ ایسا روحانی رہنما ہے کہ نماز۔ روزہ وغیرہ دینی اعمال بھی بلا اس پر ایمان لائے ہوئے بیکار ہیں۔

یہ باتیں قرآن کی حسین و جمیل۔ سادہ و بسیط۔ فطری و جمہوری تعلیمات کے بالکل متضاد ہیں جو تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد کہتا ہے۔ اور نسبی بنیاد پر کسی کو کوئی حق نہیں دیتا۔ نہ پیدائشی طور پر کسی انسان کی دینی فضیلت کو مانتا۔ نہ صلاح و تقوے کی وراثت کا قائل ہے بلکہ ہر شخص کی قیمت کا مدار خود اس کے ایمان اور عمل پر

رکھتا ہے۔ چنانچہ صدر اول کے لوگ ان باتوں سے جو ان ائمہ سے مروی ہے بالکل ناآشنا تھے۔ خود حضرت علیؓ اور حسنؓ بھی خلیفہ یا امام کے متعلق وہی سادہ نظریہ رکھتے تھے جو اہل سنت کا ہے۔ نہ اس کو معصوم سمجھتے تھے نہ تنقید سے بالاتر۔ چنانچہ اسی کافی میں روایتیں ہیں حضرت علیؓ نے فرمایا۔

لا تکفوا عن مقالۃ بحق او مشورۃ بعدل فانی لست آمن ان اخطی (سچی بات یا انصاف کے مشورہ سے نہ رکو کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں۔)

نیز امام حسین اپنے بھائی امام حسن کی صلح کو جو انھوں نے معاویہ کے ساتھ کی تھی ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے۔

لو جز انفی کان احب الیّ مما فعلہ اخی (اگر میری ناک کاٹ لی جائے تو میں اس کو اس سے بہتر سمجھوں گا جو میرے بھائی نے کیا۔)

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ جب سے ایرانی اس جماعت میں شامل ہوئے جو اپنے بادشاہوں کے تقدس اور خدا سے بالاتر ہونے کا خیال رکھتے تھے۔ اس وقت سے یہ باتیں شیعیت میں داخل ہوگئیں۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ جب سے عباسی تخت خلافت پر آگئے۔ اس وقت سے علویوں اپنے حق کے احساس کی تلخی بڑھ گئی اور وہ قرابت قریبہ کی خصوصیت کی بنا پر اپنی فضیلت اور عظمت کو زیادہ زور کے ساتھ پیش کرنے لگے۔ خلیفہ منصور کے نام نفس زکیہ کا خط پہلے آپ پڑھ چکے ہیں۔ اسی زمانے کی دوسری عظیم الشان شخصیت امام جعفر کی ہے۔ انھیں سے بیشتر روایتیں مروی ہیں۔ مگر میرے نزدیک ان روایات کا انتساب بھی ائمہ اہل بیت کی طرف مشکوک ہے کیونکہ شیعہ کی پہلی کتاب یہی کافی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں مدون ہوئی۔ اس مدت مدید میں شیعہ راویوں کے لئے ان روایات میں تغیر و تبدل بلکہ اضافہ و الحاق کا پورا موقع تھا لیکن چونکہ شیعہ ان روایات کو صحیح مانتے اور ان کے اوپر عقیدہ رکھتے ہیں اس لئے تاریخی

حیثیت سے انھوں نے اپنے کلام کی بنیاد ان کے مسلّمات پر رکھی تھی ۔ وجہ یہ اس کو بالکل نظرانداز کر دیا ۔

دیگر شیعی عقائد

مہدی منتظر کے عقیدے کی طرف ضمناً اشارہ ہو چکا ہے ۔ یہ عقیدہ شیعوں سے پیدا ہوا اور اس کی اتنی اشاعت ہوئی کہ سنیوں میں بھی مقبول ہو گیا ۔ اگرچہ بخاری و مسلم جو اہل سنت میں حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتابیں تسلیم کی گئی ہیں مہدی کی روایتوں سے خالی ہیں مگر ترمذی ، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان کو لیا ہے ۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ آخری زمانے میں اہل بیت میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا جس کی پیروی ساری امت کرے گی اور وہ اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کر کے دین اور عدل پھیلائے گا ۔

ان روایات کے اسناد میں بعض بزرگوں جیسے علامہ ابن خلدون نے بسط کے ساتھ کلام کیا ہے اور سب کو ضعیف یا موضوع قرار دیا ہے ۔ مگر شیعوں کے یہاں یہ عقیدہ ارکان دین میں داخل ہے ۔

بعضوں کے نزدیک اس کا اصلی سبب یہ ہوا کہ کربلا کے حادثے کے بعد جب اہل بیت کی خلافت کی امید منقطع ہو گئی اس وقت رؤسائے شیعہ نے اس مایوسی کو دور کرنے اور جماعت کو زندہ رکھنے کے لئے مہدی غائب کا عقیدہ پھیلایا ۔ اسی زمانے میں ابوسفیان کی شاخ سے خلافت نکل کر مروان کے ہاتھ میں چلی گئی ۔ شیعہ کی تقلید میں خالد بن یزید نے جس کو اپنے گھر سے خلافت نکل جانے کا سخت قلق تھا سفیانی کا خیال پیدا کیا یعنی ایک شخص اس خاندان کا ظاہر ہو کر ابوسفیان کی اولاد میں خلافت کو واپس لائے گا ۔ یہ روایتیں کتب حدیث میں ہیں ۔ عباسیوں نے اپنے دور میں جب دیکھا کہ علویوں اور امویوں دونوں کے گھرانوں میں ایک ایک آنے والے مہدی کا خیال ہے تو عباسی مہدی کی روایتیں گھڑیں جو طبرانی اور حاکم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں درج

کی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے اسی خیال سے اپنے بیٹے کا نام مہدی رکھا ہو۔ ابوالفرج اصفہانی لکھتا ہے کہ مطیع بن ایاس جو خطبا رمیں سے تھا اس کی مہدیت کی حدیثیں تراشا کرتا تھا۔ اس طرح پر مسلمانوں کی اکثر جماعتوں میں مہدی کا عقیدہ پیدا ہو گیا جو امت کے لئے ایک زندہ عذاب اور مستقل تعزیر بن گیا۔ سلسلہ وار مدعیان مہدیت کھڑے ہونے لگے اور دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے صرف زیدیہ باوجود اس کے کہ وہ بھی شیعہ ہیں اس عقیدے سے ہمیشہ منکر رہے۔

رجعت | قرآن نے اگرچہ صاف صاف تصریح کردی ہے۔

الم یروکم اہلکنا قبلھم من القرون انھم الیھم لا یرجعون وان کل لما جمیع لدینا محضرون	کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنی نسلیں ہم نے ہلاک کی ہیں جو ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتی ہیں اور وہ سب کی سب ہمارے پاس حاضر رکھی گئی ہیں
۳۲/۳۶	

مگر شیعہ میں مہدی کے عقیدے کے ساتھ رجعت کا بھی عقیدہ ہے یعنی ظہور مہدی کے بعد حضرت علی حسن حسین وغیرہ جملہ ائمہ دنیا میں دوبارہ واپس آئیں گے اور ان کے مخالفین ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ ومعاویہؓ و یزید وغیرہ بھی لائے جائیں گے اور ان کو سزائیں دی جائیں گی۔ شریف مرتضیٰ نے لکھا ہے کہ ابوبکر وعمر کو مہدی کے زمانے میں ایک درخت پر سولی دی جائے گی۔

تقیہ | یہ بھی امامیہ کے عقائد کا جزو ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنے عقیدے کو چھپائے رکھنا اور عمل سے اس کے خلاف ظاہر کرنا کہ کسی کو شیعیت کا شبہ نہ ہو سکے۔ کافی میں امام جعفر سے مروی ہے کہ "دین کا ۹/۱۰ حصہ تقیہ میں ہے اور جو تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے"۔ امام رضا سے کسی نے تقیہ کی بابت سوال کیا۔ فرمایا کہ "تقیہ میرا دین ہے اور میرے باپ دادا کا دین ہے جس میں تقیہ نہیں اس میں ایمان نہیں"۔ کوئی شیعہ سنیوں کے ساتھ نماز پڑھے تو

بڑے ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ بعض ائمہ اہل بیت سے مروی ہے کہ "جس نے تقیہ سے کسی سُنّی کے پیچھے نماز پڑھ لی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی"

بہت سے تاریخی واقعات کو بھی اس جماعت نے تقیہ پر محمول کیا ہے۔ مثلاً حضرت علی نے ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعتوں میں تقیہ سے کام لیا۔ امام حسن نے معاویہ کے ساتھ تقیہ سے صلح کی۔ وغیرہ اسی تقیہ سے بعض شیعہ بظاہر سنی بن گئے اور انھوں نے اپنے کو سنی علما (مثلاً ابن جریر اور ابن قتیبہ وغیرہ کے ناموں سے مشہور کر کے اپنی روایتیں اہل سنت میں پھیلائیں۔

تبرّا | شیعہ اپنے عقیدے میں ائمہ اہل بیت کو خلافت رسول کا حقدار سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ خلفاء ثلاثہ خاص کر شیخین رضی اللہ عنہما کو ظالم اور غاصب قرار دیتے ہیں۔ اور ان سے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں اور تبرّا کرتے ہیں۔ کافی میں امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ "تین قسم کے لوگ ہیں جن سے اللہ نہ کلام کرے گا نہ ان کے گناہ بخشے گا بلکہ ان کو دردناک عذاب دیگا۔ ایک وہ جس نے امامت کا دعویٰ کیا اور اس کا اہل نہ تھا۔ دوسرا وہ جس نے اللہ کے متعین کئے ہوئے امام کا انکار کیا۔ تیسرا وہ جو خیال رکھتا ہے کہ ابوبکر و عمر میں اسلام کا کوئی شائبہ بھی تھا"

ان کے عقیدے میں سوائے شیعہ کے سارے مسلمان کافر ہیں۔ اور رسول اللہ کے بعد بجز چند صحابہ کے (جو حضرت علی کی خلافت کے خواہاں تھے) جملہ صحابہ مرتد ہو گئے۔ انھیں وجوہات سے وہ خلفاء ثلاثہ۔ نیز ام المومنین حضرت عائشہ و حفصہ وغیرہ سے تبرّا کرتے ہیں اور اس کو قربت و ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کافی کی روایات میں ان حضرات پر لعنت بھیجنے کے لئے خاص خاص ماثورہ دعائیں ہیں۔

جماعت شیعہ | شروع میں حضرت علی کی خلافت کے خواہاں جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں چند مخلص اور نیک دل صحابہ تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے

حامیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ سبائی تحریک نے جس قدر حضرت عثمانؓ کے مخالف پیدا کئے اسی قدر حضرت علی کے طرفدار۔ واقعۂ کربلا سے بھی بنی امیہ کی طرف سے بہت سے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی جو اہل بیت کے حامی بن گئے۔ نو مسلم عجمی قومیں جو بنی امیہ کے استکبار و استبداد سے تنگ تھیں اپنی فروتری کو دیکھ کر اس جماعت میں شریک ہو گئیں کیونکہ یہ بنی امیہ کے مخالف تھے۔ ایرانی امراء و رؤساء اس خیال سے ان ائمہ کے حامی ہو گئے کہ ان کے یہاں سلطنت کی وراثت شاہی نسل میں چلتی تھی حکومت الٰہی ان کی سمجھ میں نہ آسکی اور انھوں نے رسول اللہ کو بھی کسریٰ خیال کیا جن کے بعد ان کی نظر میں ان کی جانشینی کے حقدار صرف ان کے اہل بیت ہو سکتے تھے۔

الغرض مختلف اسباب سے مختلف جماعتیں اس فرقے میں شامل ہوئیں جن میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ابن سبا کی طرح اسلام سے انتقام لینے کے لئے محب اہل بیت بن گئے تھے۔

شیعہ پیشیاں خوارج اور شیعہ دونوں اس بارے میں متفق تھے کہ بنی امیہ اور بنی عباس ظالم اور غاصب ہیں۔ اگرچہ دونوں کی عداوت کے اسباب مختلف تھے۔ خوارج ان کی خلافت کو اس لئے ناجائز سمجھتے تھے کہ وہ حکومت الٰہی نہ تھی بلکہ شخصی اور استبدادی سلطنت تھی اور شیعہ اس لئے کہ انھوں نے ان کے ائمہ کا حق غصب کر کے ان کو خلافت سے محروم کر دیا تھا اور خود اس پر قابض ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے دونوں فرقے ان کے دشمن تھے اور ان کے تسلط کو مٹانا چاہتے تھے۔

خوارج اپنے عقیدے کا اظہار کر کے کھلے میدان میں مقابلہ کرتے تھے جس کے باعث خلفاء کو آسانی ہوئی کہ قوت سے رفتہ رفتہ ان کو فنا کر دیا۔ لیکن شیعہ کے پاس تقیہ کا حربہ تھا۔ وہ جب موقع پاتے کھلے میدان میں آجاتے ورنہ تقیہ کے نقاب میں روپوش ہو جاتے۔ اس وجہ سے ان کا مٹانا آسان نہ تھا چنانچہ باوجود تمام سختیوں کے بھی آخر کار

یہ زندہ رہ گئے ۔ غالباً یہی علت تھی جو ائمہ اہل بیت اپنے معتقدوں کو تقیہ کی سخت تلقین اور تاکید کیا کرتے تھے اور اس کو دین کا ۹/۱۰ حصہ کہتے تھے ۔

بنی امیہ نے ابتدا ہی سے ان پر سختی شروع کی ۔ امیر معاویہ نے اپنے تمام عمّال کو حکم بھیجا کہ "جو شخص حضرت علی اور ان کے اہل بیت سے تولّا رکھے یا ان کے مناقب روایت کرے اس کا نام وظائف کے دفتر سے کاٹ دو اور اس کی شہادت ساقط الاعتبار کردو صرف شیعۂ عثمان کو اپنے پاس آنے دو اور ان کے فضائل میں جو روایتیں بیان کی جائیں ان کو معہ ان کے راویوں کے ناموں کے مجھے بھیجتے رہو ۔

کوفہ شیعوں کا مرکز تھا جس کا عامل زیاد تھا ۔ وہ چونکہ حضرت علی کے زمانے میں شیعہ رہ چکا تھا اس وجہ سے اس جماعت کے لوگوں سے واقف تھا ۔ اس نے جہاں جہاں ان کو پایا قتل کیا ۔ اس کے بعد جو کچھ رہ گئے ان کو اس کے بیٹے عبداللہ بن زیاد نے ختم کیا ۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے ان کو کھجوروں کے درختوں پر لوگوں کی عبرت کے لئے سولیاں دیں ۔ ہاتھ اور پاؤں کاٹے ۔ آنکھوں میں سلائیاں پھیریں اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مارا ۔ حجاج بن یوسف جب عراق کا والی ہوا تو اس نے بھی وہی برتاؤ رکھا اس کو کافر یا زندیق سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی شیعہ سے تھی ۔ عربی کے مشہور ادیب اصمعی کے دادا نے ایک دن اس سے کہا کہ میرے والدین نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا ۔ اس نے پوچھا کیا ؟ بولا کہ میرا نام علی رکھ دیا ۔ حجاج مسکرایا اور اس کو ایک ناحیہ کا عامل مقرر کر دیا ۔

جملہ اموی عمّال کا یہی حال تھا ۔ وہ شیعیت کی تہمت پر بھی ہاتھ پاؤں کاٹ لیتے یا قید کرکے مال و متاع ضبط اور مکان منہدم کر دیتے ۔

عباسی اور بھی زیادہ اہل بیت کی طرف سے پرحذر تھے کیونکہ وہ خود ان کے تیر کارہ چکے تھے ۔ اس وجہ سے ان کے عہد میں شیعوں پر اور بھی سختیاں بڑھ گئیں ۔ ابو مسلم

خراسانی نے سینکڑوں سپاہی اسی لئے مقرر کر رکھے تھے کہ جہاں کسی شیعہ کو پا جائیں قتل کر دیں۔ عباسی خلفا میں سب سے زیادہ ان کا دشمن متوکل تھا۔ اس نے امام حسین کی قبر ۲۳۷ھ میں معہ تمام ملحقہ عمارتوں کے منہدم کرادی جس پر ہل چلا کر کاشت ہونے لگی[۵۱]۔ لیکن باوجود ان تمام سختیوں کے شیعہ اپنے عقیدہ اور عمل سے نہیں ہٹے اور ان کے آخری خلیفہ مستعصم تک کبھی نہاں کبھی آشکارا مقابلہ کرتے رہے۔

کاش یہ ساری جماعتیں سیاسی مقصد میں متحد ہوتیں اور سُنّی۔ خارجی اور شیعہ سب اسلام کو پیش نظر رکھتے اور ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش میں اپنی قوتیں برباد نہ کرتے تو آج اسلام کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ یہ قریشی خانوادوں کی حکومت کا سودا تھا جس نے ہیجان برپا کیا۔ اور ان کی باہمی رقابتوں نے امت کا شیرازہ بکھیرا۔ ورنہ مسئلہ نہایت سادہ اور صاف تھا کہ خلافت کا مدار انتخاب عام پر رکھدیا جائے۔ شیعہ جو امام منصوص کے قائل ہیں انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اللہ اگر کسی کو ماں کے شکم سے خلافت کے لئے تیار کرتا تو اس کا تخت خلافت پر آجانا لازمی تھا۔ اور جب نہ آسکا تو سمجھنا چاہئے کہ انتخاب جمہور ہی کا حق ہے۔

---

۵۱ ان مظالم کی تفصیل دیکھنی ہو تو ابوالفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبین اور ابوبکر خوارزمی کے بعض رسائل کا مطالعہ کیجئے۔

معتزلہ

اس جماعت کی ابتدا بصرہ میں ہوئی بانی واصل بن عطاء تھے اور عمرو بن عبید۔ یہ دونوں موالی میں سے تھے اور امام حسن بصری کے شاگرد۔ بصرہ سے اس کی شاخ بغداد میں پہنچی۔ بصری سلسلہ یہ ہے۔

حسن بصری

واصل بن عطاء متوفی ۱۳۱ھ — عمرو بن عبید متوفی ۱۴۳ھ

(واصل بن عطاء) عثمان الطویل — حسن بن ذکوان

(عمرو بن عبید) خالد بن صفوان — ابراہیم بن یحیی

ابو ہذیل علاف — ابو بکر اصم — معمر بن عباد

ابراہیم نظام — ابو علی — ابو یعقوب — ہشام — بشر بن المعتمر (راس البغدادین)

جاحظ — ابو علی جبائی — عباد بن سلیمان

ابو علی جبائی کے شاگرد تھے امام ابو الحسن اشعری راس المتکلمین۔ بغدادی شاخ یہ ہے۔

بشر بن المعتمر متوفی ۲۱۰ھ

ابو موسیٰ مردار — احمد بن ابی دؤد — ثمامہ بن الاشرس

(ابو موسیٰ مردار) جعفر بن حرب

ابو جعفر اسکافی — عیسیٰ بن ہیثم صوفی

(ثمامہ بن الاشرس) جعفر بن مبشر

ابو الحسین خیاط

ابو القاسم بلخی

عراق متعدد اہل مذاہب کا گہوارہ تھا۔ یہودی۔ نصرانی۔ مجوسی۔ مانوی۔ زرتشتی

صابی۔ ولیصانی اور دہری وغیرہ ۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب ان میں سے لوگ مسلمان ہونے لگے اُس وقت ان قوموں نے مسلمانوں کے ساتھ بحثیں شروع کیں ۔ اہل علم کی ایک جماعت اسلام کی تائید اور ان کی تردید کے لئے کھڑی ہوئی ۔ اُس نے پہلے ان کے مذہبی حقائق کو سمجھا ۔ پھر انھیں کے اصول پر ان کے جوابات دینے کی کوشش کی ۔ ان میں سے بعض مذاہب مثلاً یہودیت وعیسائیت یونانی فلسفہ سے بھی مسلح تھی اس لئے اس جماعت نے اُس سے بھی واقفیت پیدا کی تاکہ ان کے اعتراضات کی مدافعت کر سکے ۔ اِس کے لئے یہ بھی لازم تھا کہ عقلیت کی راہ سے ان بحثوں میں گھُسے کیونکہ منقولی دلائل سے کام نہیں چل سکتا تھا ۔ اس وجہ سے اس جماعت کا طریق فکر محدثوں سے الگ ہو گیا اور یہ معتزلہ کے نام سے مشہور ہوئی ۔

اصول خمسہ معتزلہ میں باہم بعض امور میں اختلافات ہیں لیکن اصل مبادی میں سب کے سب متفق ہیں اور وہ پانچ ہیں ۔

۱ ۔ توحید ۲ ۔ عدل ۳ ۔ وعدہ وعید ۴ ۔ بین بین ۵ ۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

توحید ہر مسلم کا ایمان ہے لیکن اس جماعت نے اس کی مخصوص تفسیر کی یعنی ذات الٰہی کو صفات سے منزہ قرار دیا ۔ اس کے نزدیک قدرت ۔ ارادہ ۔ سمع ۔ بصر ۔ حیات وکلام وغیرہ صفات الٰہی جو قرآن میں بیان کئے گئے ہیں ۔ بذات خود قائم نہیں ہیں ورنہ قدماء کا تعدد لازم آئے گا بلکہ عین ذات الٰہی ۔ قادر سمیع اور بصیر وغیرہ ہے ۔ اہل سنت صفات کو عین ذات نہیں مانتے بلکہ قائم بالذات کہتے ہیں

اسی طرح عدل کے بھی تمام مسلمان قائل ہیں کہ اللہ عادل مطلق ہے کسی پر ظلم نہیں کرتا لیکن معتزلہ اس میں اور آگے جاتے ہیں وہ کہتے ہیں ۔

(۱) اللہ نے مخلوق کو ایک نتیجہ کے لئے پیدا کیا ہے جو اس کے لئے سرتاسر خیر ہے ۔

(۲) اللہ مخلوق کے لئے نہ شر کا ارادہ کرتا ہے نہ حکم دیتا ہے اسی بنا پر وہ اشیاء

کے حسن و قبیح کو اہل سنت کی طرح شرعی نہیں بلکہ ذاتی قرار دیتے ہیں۔

(۳) انسان سے اچھے یا برے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان کا خالق وہ خود ہے اور انسانی ارادہ افعال کی تخلیق میں آزاد ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ان کے اوپر سزا و جزا ملتی ہے۔

وعد و وعید سے ان کی مراد یہ ہے کہ جس عمل پر جو وعدہ یا وعید ہے اس کا مترتب ہونا لازمی ہے اور ایمان صرف قلبی تصدیق کا نام نہیں ہے بلکہ ادائے واجبات بھی اس کا جزو ہے۔ اگر کوئی اللہ و رسول کو مانے اور اعمال شرعیہ ادا نہ کرے تو مومن نہیں ہے۔ ہر عمل خواہ فرض ہو یا نفل ایمان کا جزو ہے۔ جس قدر عمل بڑھتا ہے اسی قدر ایمان بڑھتا ہے۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ فاسق ہے جو ان دونوں کا درمیانی درجہ ہے۔ اسی کا نام بین بین رکھتے ہیں جو ان کے الفاظ میں "منزلۃ بین منزلتین" کہا جاتا ہے۔

امر بالمعروف کو بھی فرض سمجھتے ہیں لیکن خوارج کی طرح فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ۔ اور خروج بالسیف اس وقت ان کے نزدیک جائز ہے جب کامیابی کی پوری امید ہو۔

ان اصول پر یہ جماعت کھڑی ہوئی۔ پھر ان اصول سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے جن میں دوسری اسلامی جماعتوں سے مخالفت ہو گئی۔ مگر علمی، عقلی اور ادبی لحاظ سے ان لوگوں نے اس وقت کی جملہ اسلامی جماعتوں پر نمایاں فوقیت حاصل کر لی۔ یونانی علوم نیز دیگر مذاہب کے عقائد اور ان کی تاریخوں سے بھی باخبر تھے۔ قرآن میں بھی ان کو توغل تھا۔ اگرچہ آیات کی تاویلیں اپنے اصول کے مطابق کرتے تھے۔ حدیثوں کو خواہ محدثین کے نزدیک وہ کتنی ہی قوی ہوتیں اپنے اصول کے خلاف پاتے تو موضوع کہہ دیتے۔ یعنی عقل کو حدیث پر حاکم سمجھتے تھے۔ حدیث کو عقل پر نہیں بلکہ عمرو بن عبید اور ابراہیم نظام جن کی شخصیتیں ان میں نہایت ممتاز تھیں بجز قرآن اور عقل کے کسی شے پر دین کا مدار

نہیں رکھتے تھے۔

صفات معتزلہ عقائد میں پختہ۔ اعمال شرعیہ میں متشدد۔ روزہ نماز کے سخت پابند اور حج کے عاشق تھے۔ دین کی حفاظت، مخالفوں سے مقابلہ، اور اسلامی تعلیمات کے عقلی ثبوت کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے جس مقام پر اس کی ضرورت دیکھتے گرمی یا سردی اور سفر کی مشقتوں کا خیال کئے بغیر پہنچتے۔

زبانوں میں طلاقت تھی۔ فصاحت میں ممتاز تھے اور اس زمانے کے عقلی علوم سے مسلح۔ اس لئے بحثوں میں غلبہ حاصل کرتے۔ ملحدوں۔ دہریوں اور دیگر اہل مذاہب کی تردید اور اپنے عقائد کے اثبات میں کتابیں اور رسالے لکھتے۔ اور مجامع اور مجالس میں دین کی حمایت میں تقریریں کرتے جو دلنشیں اور بلیغ ہوتیں۔ غیر مذاہب کے مجادلوں پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

زہد و تقویٰ اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے اس قدر مقبول تھے کہ جہاں جاتے ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ہو جاتے۔ امت کی ہدایت اور رہنمائی یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کے اصول میں داخل تھی جس کے لئے اپنے آپ کو وقف سمجھتے تھے۔ واصل بن عطا نے اپنے خاص شاگردوں میں سے عبداللہ بن حارث کو مغرب میں حفص بن سالم کو خراسان میں۔ ایوب کو جزیرہ میں حسن بن ذکوان کو کوفہ میں اور عثمان الطویل کو آرمینیہ میں بھیجا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مقامات مذکورہ میں بڑی بڑی جماعتیں بن گئی تھیں جو امر بالمعروف کرتی تھیں۔ اور امت کا ایک طبقہ ان کے اثر میں تھا۔ خاصکر وہ لوگ جو اس وقت کی علمی تحریکوں میں حصہ لیتے تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں تاہرت کے تحت میں لکھا ہے کہ یہاں واصلیہ یعنی اصحاب واصل بن عطاء کے کم و بیش تیس ہزار آدمی ہیں جو خیموں میں رہتے ہیں اور جابجا دین کی تلقین اور تبلیغ کرتے پھرتے ہیں اسی قسم کی جماعتیں ان کی مغرب سے مشرق تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے باہمی

تعلقات بمقابلہ دوسری اسلامی جماعتوں کے زیادہ مخلصانہ تھے عقلیت کی وجہ سے توہم پرستیوں سے آزاد تھے جن کے قائل تھے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں مگر آیت

انہ یراکم ہو وقبیلہ من حیث لا ترونہم ۲۷ | وہ اور اس کا قبیلہ دیکھتا ہے تم کو جہاں سے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے۔

کے مطابق یہ نہیں مانتے تھے کہ وہ انسانوں کو نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کے بچوں نیز عورتوں میں بھوتوں اور چڑیلوں کا خوف بالکل نہ تھا۔

معتزلہ اور خلفاء

بنی امیہ کے زمانے میں معتزلہ کا حلقہ زیادہ نہیں پھیلا تھا مگر ان کی جماعت قائم ہو چکی تھی خلیفہ ولید بن یزید نے جب لہو و لعب اور شراب و غنا میں وقت کو برباد کرنا شروع کیا اس وقت سب سے زیادہ اس کی مخالفت میں اسی جماعت نے حصہ لیا اور یزید ثالث کی جو ان کا ہم خیال تھا پوری امداد کی۔ یہاں تک کہ ولید مارا گیا اور یزید اس کی جگہ تخت پر آگیا بعض معتزلہ اس کو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بھی بہتر قرار دیتے تھے۔

عباسی عہد میں عمرو بن عبید راس المعتزلہ ابوجعفر منصور کے دربار میں بہت عزت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس پر تنقید بھی کرتا اور اس کے مظالم اس کے سامنے گنا تا۔ منصور نے ایک دن کہا کہ یہ شاہی مہر لو اور تم اور تمہارے ساتھی اس کام کو سنبھالو۔ اس نے کہا کہ بہیں آپ کے دروازے پر ہزار قسم کے مظالم ہیں۔ پہلے ان کو دور کیجئے پھر ہم کو بلائیے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ سچے دل سے بلا رہے ہیں۔

محمد (نفس زکیہ) نے اپنے خروج سے پہلے عمرو کو خط لکھا تھا جس میں غالباً اس سے نصرت چاہی تھی۔ منصور کو اس کا پتہ لگ گیا۔ عمرو سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس محمد کا کوئی خط آیا ہے؟ کہا کہ ایک خط آیا ہے جو انھیں کے خط سے ملتا جلتا ہے۔ پوچھا پھر کیا جواب دیا؟ بولا کہ تم کو میری رائے معلوم ہے کہ میں مسلمانوں میں تلوار کے استعمال کو جائز

نہیں سمجھتا۔ کہا۔ ہاں۔ لیکن قسم کھائیے۔ اس نے کہا کیا فائدہ۔ میں نے اگر تقیہ سے کہا ہے تو تقیہ سے قسم بھی کھا لوں گا۔ منصور نے کہا۔ نہیں نہیں۔ تم بالکل سچے ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ منصور کی خلافت سے بیزار تھا لیکن اس کے خلاف تلوار اٹھانا جائز نہیں سمجھتا تھا۔ اور یہی بات تھی جس کی وجہ سے خلفاء عباسیہ نے معتزلہ کو سیاسی حیثیت سے کبھی نہیں چھیڑا۔ کیونکہ یہ لوگ ان کے حامی نہ تھے تو ان کے دشمنوں کے بھی حامی نہ تھے۔

منصور نے اس سے اپنی تائید کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے انکار کر دیا۔ دروازے پر ابوایوب موریانی وزیر ملا اور کہا کہ تم نے خلیفہ کو مایوس کر دیا۔ عمرو نے کہا کہ تم کس لئے ہو؟ اس کی مدد کرو۔ ملت کی بدنصیبی ہے کہ اس کے مہمات تم جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

ہارون الرشید کے عہد میں ان کا زور کم رہا۔ کیونکہ وہ ان کے جدلیات کو ناپسند کرتا تھا۔ اور اس نے حکم دے رکھا تھا کہ عقائد میں بحثیں نہ کی جائیں لیکن اس کے بیٹے مامون الرشید نے جب اعتزال کو اختیار کیا اس وقت معتزلہ کا ستارہ چمک اٹھا جو معتصم اور واثق کے زمانوں میں عروج پر رہا اور متوکل کے زمانے میں ڈوب گیا۔

مامون عباسی

مامون جب مرو سے ۲۰۴ھ میں بغداد میں آیا تو اس نے اپنے علمی ذوق کی وجہ سے قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کو حکم دیا کہ پایۂ تخت کے علماء کو دربار میں لائیں۔ انھوں نے مختلف جماعتوں کے چالیس علماء چن کر حاضر کئے۔ مامون نے مجلس مناظرہ قائم کی جو ہر منگل کے دن منعقد ہوتی۔ اس میں وہ خود بھی شریک ہوتا اور ہر ہر فرقہ کے اہل علم آزادی کے ساتھ بحث کرتے۔ یہاں تک کہ امامیہ اور زیدیہ بھی مسئلہ امامت پر بیباکی کے ساتھ دلیلیں لاتے اور معتزلہ اپنے

عقائد کا ثبوت پیش کرتے۔

اس سے پہلے اصحاب حدیث کے غلبہ کی وجہ سے کوئی شخص علانیہ کسی امر میں ان کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا تھا لیکن اس مجلس مناظرہ نے اس کا راستہ کھول دیا۔ مامون کا مقصد غالباً یہ تھا کہ باہمی مناظرات سے اختلافات مٹ جائیں گے اور تمام فرقے ہم خیال ہوکر متحد ہو جائیں گے لیکن نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ کیونکہ اس نے خود اپنے آپ کو ان بحثوں سے بالاتر نہیں رکھا بلکہ معتزلہ کی تائید کی۔ خاص کر مسئلہ خلق قرآن میں۔ اس وجہ سے محدثین اور فقہا اور ان کے اثر سے جمہور اہل سنت اس کے مخالف ہو گئے اور یہی اور صرف یہی ایک مسئلہ تھا جو اعتزال کی تباہی کا موجب ہوا۔ اس لئے اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

فتنہ خلق قرآن

معتزلہ نے جب تنزیہ ذات اور نفی صفات کا عقیدہ نکالا اس وقت اس بحث کے سلسلہ میں ذات باری سے صفت کلام کی نفی کے بعد قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث درمیان میں آئی۔ سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جعد بن درہم نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا پھر جہم بن صفوان نے اس کی پیروی کی۔ محدثین نے اس قول کو اسلام کے خلاف قرار دیا۔ چنانچہ جعد کو خالد بن عبداللہ قسری والی عراق نے عید اضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا[1]۔ اور جہم کو سلمہ بن احوز نے مرو میں قتل کر ڈالا لیکن اس خیال کے پیرو باقی رہ گئے اور جہم کی نسبت سے ان کی جماعت فرقہ جہمیہ کے نام سے موسوم ہوئی

---

[1] خالد نے جعد کو بربنائے تعصب قتل کیا تھا۔ غالباً اسی انسانی قربانی دینے کی سزا اس کو یہ ملی کہ ولید بن یزید جب خلیفہ ہوا تو اس نے اس جرم پر کہ خالد نے اس کو ولی عہدی سے نکالنے میں ہشام کی موافقت کی تھی اس کو اس کے جانی دشمن یوسف بن عمر ثقفی والی عراق کے حوالہ کر دیا۔ یوسف نے خالد کو شکنجہ میں کس کر اس کے سینے کو ریتی سے ریت ڈالا۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

مامون الرشید کے زمانہ میں [illegible] نے بہت اہمیت اختیار کر لی کیونکہ خود وہ اور اس کے درباری علما اسی خیال کے ہو گئے۔ اب انھوں نے محدثین کے خلاف قوت سے کام لینا شروع کیا۔ بہت سے محدثوں کو کافر قرار دے کر قتل کیا۔ اور سینکڑوں کو قید کی سزائیں دیں اور ابتلا و امتحان میں ڈال کر اذیتیں پہنچائیں۔ اکثر علما نے مجبوراً قرآن کو مخلوق کہہ کر اپنی جانیں بچا لیں مگر امام احمد بن حنبل اس ابتلا میں ثابت قدم رہ گئے۔ سنہ ۲۱۸ھ میں جبکہ مامون طرسوس میں تھا اس کے حکم سے اسحاق بن ابراہیم امیر بغداد نے امام احمد کو بیڑیاں پہنا کر سپاہیوں کی حراست میں اس کے پاس روانہ کیا۔ مقام رقہ میں پہنچے تھے کہ مامون کے مرنے کی خبر آ گئی۔ اس لئے پھر بغداد میں واپس لا کر قید کر دئے گئے۔

مامون اپنے بھائی معتصم کو جو اس کا جانشین ہوا سخت تاکید کر گیا تھا کہ میرے بعد کوشش کر کے اس "مشرکانہ" عقیدے کو مٹا دینا۔ بھائی کی وصیت نیز احمد بن دواد راس الاعتزال کے اثر سے جو یحییٰ بن اکثم کی جگہ قاضی القضاۃ بھی تھا اور وزیر بھی۔ معتصم نے سنہ ۲۲۰ھ میں مجلس مناظرہ منعقد کی۔ امام احمد بن حنبل پابجولاں لائے گئے۔ خلیفہ اور وزیر دونوں جاہ و جلال کے ساتھ جلوس فرما تھے۔ دیگر علماء معتزلہ بھی جمع تھے قضاۃ فقہا۔ امراء و رؤسا سے دربار بھرا ہوا تھا۔ وہ معتصم کے سامنے بٹھائے گئے۔

معتصم ۔ قرآن کی بابت کیا کہتے ہو؟

امام احمد۔ کوئی آیت یا روایت پیش کی جائے اس کے مطابق کہنے کو تیار ہوں۔

ایک معتزلی ۔ قرآن میں ہے "ما یاتیہم من ذکر من ربہم محدث" کیا محدث مخلوق نہیں ہے؟

امام ۔ قرآن کے لئے الذکر کا لفظ آیا ہے۔ الف لام کے ساتھ۔ اس آیت میں ذکر بغیر الف لام کے ہے اس لئے اس سے قرآن مقصود نہیں[1]۔

---

[1] امام موصوف کا یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ آیات میں بلا الف لام کے بھی ذکر کا لفظ قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ طلاق میں ہے "قد انزل اللہ الیکم ذکرا" غالباً اسی وجہ سے اپنے (اگلے صفحہ پر)

دوسرا معتزلی - قرآن میں ہے "اللہ خالق کل شئی" کیا قرآن شئی نہیں ہے؟
امام - اللہ نے اپنے لئے قرآن میں کئی جگہ نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً "کتب علی نفسہ الرحمۃ" پھر فرماتا ہے "کل نفس ذائقۃ الموت" کیا تمھارے خیال میں نفس الٰہی کے لئے بھی موت ہے؟
تیسرا معتزلی - عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ "ان اللہ خلق الذکر"
امام - اس روایت کا صحیح لفظ ہے "ان اللہ کتب الذکر"
چوتھا معتزلی - حضرت ابن مسعود سے مروی ہے "ماخلق اللہ من جنۃ ولا نار ولا سماء ولا ارض اعظم من آیۃ الکرسی۔"
امام - خلق کا فعل جنت، نار، سماء اور ارض سے متعلق ہے نہ کہ آیۃ الکرسی سے
پانچواں معتزلی - کلام اللہ کو غیر مخلوق کہنے سے اس کی شابہت اللہ کے ساتھ لازم آتی ہے۔
امام - اللہ احد ہے صمد ہے۔ نہ کوئی اس کا شبیہ ہے نہ عدیل۔ لیس کمثلہ شئی۔
معتصم - ہاں تو کیا کہتے ہو؟
امام - کوئی آیت یا روایت دیجئے تو اس کے مطابق کہوں۔
ایک معتزلی نے عقلی دلائل پیش کرنے شروع کئے۔
امام - میں اس کو نہیں جانتا۔ یہ نہ روایت ہے نہ آیت
معتزلی - خلیفہ سے مخاطب ہوکر - امیر المومنین! جب ان کو کوئی دلیل نظر آتی ہے تو

رسالہ رد جہمیہ میں انھوں نے اس کا دوسرا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ذکر میں وہ ذکر بھی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ اور وہ ذکر بھی ہے جو رسول کے ذریعہ سے ہوتا ہے محدث کا لفظ اسی دوسرے ذکر کے بارے میں ہے۔ جہاں قرآن مراد ہوگا وہاں محدث یا مخلوق کا لفظ بولنا صحیح نہ ہوگا۔ لیکن یہ جواب بھی محض تکلف اور تحکم ہے "ما یاتیھم من ذکر من ربھم" سے قرآنی آیات کسی طرح خارج نہیں کی جاسکتیں۔ اس کا صحیح جواب صرف یہ تھا کہ قرآن بیشک محدث ہے مگر مخلوق نہیں۔ آئندہ اوراق میں ہم اس کی حقیقت واضح کریں گے۔

ہمارے اوپر چھپٹے پڑتے ہیں اور جب ہم کچھ کہتے ہیں تو بول اٹھتے ہیں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔

احمد بن دواد۔ امیرالمومنین! یہ گمراہ ہے، گمراہ کن ہے اور بدعتی۔

اس بحث کے بعد قید خانے واپس بھیج دئے گئے۔ دوسرے دن پھر لائے گئے اور مناظرہ ہوا۔ تیسرے دن جب اہل دربار تھک کر مایوس ہو گئے اس وقت معتصم نے تازیانہ مارنے کا حکم دیا۔ مسعودی کے قول کے مطابق ۳۰ کوڑے لگائے گئے تھے کہ ان کے جسم سے خون جاری ہو گیا اور بیہوش ہو گئے۔ معتصم نے قید خانے میں بھیج دیا اور ایک طبیب مقرر کر دیا جس کے علاج سے اچھے ہوئے۔

معتصم ان لوگوں کو جو قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے قتل کر دیتا تھا۔ اس دن بھی جس دن امام کو دربار میں بحث کے لئے طلب کیا تھا دو شخصوں کو اسی جرم میں قتل کر چکا تھا۔ لیکن امام موصوف کے قتل کی جرأت اس نے نہیں کی جس کے حسب ذیل اسباب تھے۔

(۱) امام احمد کے ساتھ جمہور کی عقیدت بہت زیادہ تھی اس لئے وہ ڈرا کہ ان کے قتل سے فتنۂ عام برپا ہو جائے گا جس کا مٹانا نہایت دشوار ہوگا۔

(۲) معتصم خود شجاع تھا اور شجاعت کا قدردان۔ امام موصوف کے مناظرہ سے ان کے استقلال اور ثبات قلب کا نقش اس کے دل پر بیٹھ گیا جس کی وجہ سے ان کو قتل کرنا گوارا نہ کیا۔

(۳) اس نے ان کے بشرہ سے ان کی راست بازی اور خلوص نیت کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ صرف اس وجہ سے قرآن کو غیر مخلوق کہتے ہیں کہ مخلوق کہنے کی کوئی دلیل نہیں پاتے

آخر کار ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سات سال تک وہ زندہ رہا مگر پھر ان سے کچھ نہیں بولا۔ ۲۲۷ھ میں اس کے مرنے پر واثق خلیفہ ہوا۔ وہ بھی خلق قرآن کے عقیدہ کی حمایت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ احمد بن نصر کو اس کی مخالفت پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

لیکن امام احمد سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا۔
جب متوکل خلیفہ ہوا۔ اور اس نے دیکھا کہ اس فضول فتنہ سے نہ خلافت کو کوئی فائدہ ہے نہ اُمت کو۔ بلکہ دن بدن نفرت کی خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے تو ۲۳۴ھ میں تمام صوبوں میں حکم بھیجدیا کہ کوئی قرآن کو مخلوق نہ کہے۔ اس پر سارے ملک میں خوشی منائی گئی۔ اور لوگ جو معتزلہ کی سختیوں سے تنگ تھے خوش ہوگئے۔ بلکہ رائے عامہ ان کے خلاف اس قدر بھڑک اُٹھی کہ جمہور نے ان سے انتقام لینا شروع کیا۔ متوکل نے محدثین کی مدارات کے لئے ان کو سامرا میں بلاکر انعامات دئے اور صفات اور رویت کی احادیث روایت کرنے کی آزادی عطاکی۔ چنانچہ ان کی مجالس میں غیر معمولی مجمع ہونے لگا۔ امام احمد بن حنبل جو اس امتحان میں پورے اتر گئے تھے محدثوں کے سردار مانے گئے۔ یہاں تک کہ یہ اصول مسلم ہوگیا کہ جس کو وہ ثقہ کہدیں ثقہ ہے اور جس کو ضعیف کہدیں ضعیف۔
لوگ متوکل کے شکریہ کے ساتھ اس کے لئے دعاء خیر کرنے لگے اور اس قدر تعریف کی کہ بعض حنابلہ نے اس بدتدبیر اور عیاش خلیفہ کو جس کے محل میں بقول ابو بکر خوارزمی بارہ ہزار حرم تھیں۔ خلفاء راشدین کے ہم رتبہ قرار دیا۔
حنبلیوں کا زور اس قدر بڑھ گیا کہ اُنھوں نے بغداد میں احتساب اپنے ہاتھ میں لے لیا معتزلہ خوف سے چھپ گئے اور جماعتی لحاظ سے ان کا وجود ختم ہوگیا۔

توضیح مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ جس نے نہ صرف امت بلکہ عباسی سلطنت میں تزلزل ڈال دیا تھا محض فلسفیانہ غلو اور قرآن کی ناواقفیت سے پیدا ہوا تھا۔ معتزلہ سمجھتے تھے کہ غیر مخلوق کہدینے سے قرآن قدیم ہوجاتا ہے جس سے قدماء کا تعدد لازم آتا ہے۔ اس لئے یہ عقیدہ مشرکانہ ہے۔ لہذا خلیفۂ اسلام کا یہ فرض ہے کہ ایسے عقیدے کو جو توحید کے خلاف ہے قوت سے مٹائے۔ دوسری

طرف مخالفوں کے پاس بھی غیر مخلوق کہنے کے دلائل اس قدر واضح نہ تھے کہ معتزلہ کی تشفی کر سکتے نتیجہ یہ ہوا کہ تعصب درمیان میں آیا اور معاملہ بہت بڑھ گیا۔ محدثین کے لئے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ آنحضرت کی حدیثیں سنا سنا کر عوام کے ایمان کو جوان کی قوت تھے تازہ رکھیں چنانچہ متعدد حدیثیں اس مضمون کی کہ "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" مختلف پیرایوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئیں اور وعظ و تذکیر کے ذریعے سے لوگوں میں پھیلائی گئیں لیکن اگر قرآن میں زیادہ غور کیا جاتا تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا اور روایات کی مطلق ضرورت نہ پڑتی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ رد جہمیہ میں سورۂ اعراف کی آیت "الا لہ الخلق والامر" سے یہ استدلال کیا ہے کہ "خلق اور امر دو مختلف چیزیں ہیں کیونکہ قرآن میں یہ اصول عام ہے کہ جب وہ ایک ہی چیز کا مختلف الفاظ میں ذکر کرتا ہے تو ان کے درمیان فصل کے لئے واؤ نہیں لاتا۔ مثلاً سورۂ حشر میں ہے" الملک القدوس السلام المؤمن المہیمن العزیز الجبار المتکبر" اور جب دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں تو ان کے درمیان واؤ عاطفہ داخل کرتا ہے جیسے سورۂ فاطر میں ہے " وما یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور۔ ولا الظل ولا الحرور۔ وما یستوی الاحیاء ولا الاموات" سورۂ تحریم میں ایک ہی آیت میں دیکھو" ازواجاً خیراً منکن مسلمات مومنات قانتات تائبات عابدات سائحات ثیبات وابکارا" جہاں تک ایک ہی چیز کے مختلف اسماء اور صفات تھے وہاں تک بلا فصل رکھا لیکن ثیبہ اور بکر دو مختلف صفتیں ہیں جن کا باہم اجتماع نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان میں واؤ لا کر فصل کر دیا۔ لہٰذا خلق کا اطلاق امر پر اور امر کا اطلاق خلق پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن امر ہے۔ سورۂ طلاق میں ہے" ذالک امر اللہ انزلہ الیکم" اس لئے اس کو خلق نہیں کہہ سکتے"۔ یہ استدلال ان کا صحیح ہے لیکن عالم امر کی مزید حقیقت ان کے اوپر منکشف نہیں تھی کہ وہ عالم خلق کی طرح حادث ہے

اور محدث کا لفظ اس کے لئے بولا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے معتزلہ کے استدلال "ما یاتیھم من ذکر من ربھم محدث" کا ٹھیک جواب وہ نہ دے سکے۔

اصلیت یہ ہے کہ امر کا لفظ جس طرح قرآن میں جا بجا بہت سے معنوں میں مستعمل ہوا ہے اسی طرح اس کی متعدد نوعیتیں بھی قرآن سے ثابت ہوتی ہیں۔

امر تکوینی۔ یعنی اشیاء کی تخلیق کا حکم۔ سورہ یٰسین میں ہے۔

انما امرہٗ اذا اراد شیئًا ان یقول لہٗ کن فیکون	اس کا حکم جب وہ کسی شئی (کی تخلیق) کا ارادہ کرتا ہے بس یہ کہ اس سے کہتا ہے کہ ہوجا وہ ہوجاتی ہے۔

امر تدبیری۔ یعنی عالم خلق کے انتظامی اور تدبیری احکام۔ سورۂ یونس میں ہے۔

خلق السموٰات والارض فی ستۃ ایام ثم استوٰی علی العرش یدبر الامر	آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر برا جا تدبیر کرتے ہوئے امر کی

آیت زیر بحث "الا لہ الخلق والامر" میں جو امر مذکور ہے وہ تدبیری ہے۔ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ نے ان کے انتظام کی تدبیر کے لئے اپنے اوامر نافذ فرمائے۔ سورۂ حٰم سجدہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ ہم نے دو دن میں زمین پیدا کی پھر دو دن میں پہاڑ اور زمین کے جملہ اندرونی ذخیرے بنائے۔ پھر دو دن میں ساتوں آسمان کھڑے کئے۔ اس کے بعد "اوحٰی فی کل سماءٍ امرھا" ساتوں بلندیوں میں ان کے تدبیری اور انتظامی اوامر نافذ کئے۔ ایسا ہی ساتوں پستیوں کے متعلق سورۂ طلاق میں فرمایا۔

خلق سبع سمٰوات ومن الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن	سات بلندیاں پیدا کیں اور ویسی ہی سات پستیاں جن میں اوامر اُترتے ہیں۔

اس طرح بلندیوں اور پستیوں سب میں اوامر تدبیری نافذ ہیں۔ سورۂ سجدہ میں ہے۔

يدبر الامر من السماء الى الارض | وہ امر کی تدبیر کرتا ہے بلندی سے پستی تک

اب واضح ہوگیا کہ عالم امر عالم خلق کے بعد ہے جس کی ان آیات کے علاوہ بھی متعدد آیتوں میں تصریح ہے۔ سورہ سجدہ میں ہے۔

خلق السموات والارض وما بينهما فى ستة ايام ثم استوىٰ على العرش | پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پھر عرش پر مستولی ہوا۔

عرش اسی کا نام رکھا جہاں سے اوامر تدبیری نافذ ہوتے ہیں اور جن کا نفاذ رحمت کی تجلی سے ہوتا ہے "الرحمٰن على العرش استوىٰ" اس لئے عرش۔ استوا علی العرش اور تنفیذ اوامر تدبیری سب خلق کے بعد کی چیزیں ہیں اور عالم خلق اور عالم امر دونوں حادث ہیں اور دونوں کی ہر شئی پر محدث کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔

اسی امر تدبیری کے ذیل میں امر تشریعی ہے۔ وہ بھی حادث اور محدث ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں سورۂ جاثیہ میں ہے۔

وآتيناهم بينات من الامر۔ | اور ہم نے کھلی دلیلیں امر (شریعت) کی ان کو دیں۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی سورہ میں خطاب ہے۔

ثم جعلناك على شريعة من الامر | پھر ہم نے تجکو عالم امر سے ایک شریعت پر لگا دیا۔

وحی اور کلام الٰہی اسی امر تشریعی میں داخل ہے۔ سورۂ طلاق میں ہے

ذالك امر الله انزله اليكم | یہ امر الٰہی ہے جس کو اس نے تمہاری طرف اتارا

سورۂ شوریٰ میں ہے

وكذالك اوحينا اليك روحا من امرنا | ایسا ہی ہم نے تیری طرف اپنے امر کی ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔

اس لئے قرآن جو امر تشریعی ہے حادث اور محدث ہے مگر عالم امر سے ہے۔ عالم خلق سے نہیں ہے۔ لہذا اس کو مخلوق کہنا قرآن کے خلاف ہے۔

فنا کے اسباب | معتزلہ کے مٹنے کے اسباب خود ان کے اصول اور اعمال میں

غور کرنے سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اور وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) یہ جماعت دین میں ایمان اور عقلیت (دلائل علمی) دونوں کی راہ سے داخل ہوئی تھی اور اعتزال کے قوام ماہیت میں فلسفہ شامل تھا۔ اس وجہ سے اس کا راستہ امت سے نمایاں طور پر الگ ہو گیا۔

ایمان کے اجزا :۔ اللہ۔ رسول۔ ملائکہ۔ کتاب۔ یوم آخر۔

اسلام کے ارکان :۔ کلمہ طیبہ۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ

اعتزال کے عناصر :۔ توحید۔ عدل۔ وعد و وعید۔ بین بین۔ امر بالمعروف

یہی وجہ تھی کہ جو پختگی محدثین کے دین میں تھی وہ معتزلہ میں نہیں پیدا ہو سکی۔

(۲) معتزلہ اگرچہ عقلیت پرست تھے اور حدیثوں کے راویوں۔ تابعین عظام بلکہ صحابہ کرام پر بھی بے تحاشا تنقید کرتے تھے مگر عوام کی طرح ان مذہبی جھگڑوں میں بھی حصہ لیتے تھے جو روایتوں سے پیدا ہوئے تھے۔ خاص کر ابوبکرؓ و علیؓ کی بحث میں۔ بصری جماعت کی بڑی تعداد حضرت ابوبکرؓ کو افضل سمجھتی تھی اور بغدادی شاخ تمام تر حضرت علی کو۔ ان کی عقلیت شخصیت پرستی سے ان کو نکال نہیں سکی تھی[1]۔ یہاں تک کہ استبدادی خلافتوں کو بھی صحیح سمجھتے اور اُن کے ساتھ موالات رکھتے رہے۔

(۳) قرآن میں وہ تدبر اور تفکر کرتے تھے لیکن اس سے زیادہ تر غرض ہوتی تھی اپنے مخصوص عقائد کی دلیل یا آیات اور معجزات کی تاویل۔ اس لئے قرآن کے پاس بھی نہ پھٹک سکے اور پہلا ہی قدم جو اس میں اُنھوں نے رکھا غلط پڑا۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ قرآن نے اپنی آیات کو محکمات اور متشابہات میں تقسیم کیا ہے۔ اور متشابہات کے متعلق تصریح کر دی ہے کہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کو صرف مان لینا چاہئے۔ جو لوگ علم میں پختہ ہیں ان پر ایمان لاتے ہیں۔ مگر جن کے دلوں

---

[1] یہ صرف قرآن ہے جو انسان پر طاری ہو جاتا ہے تو ہر ماحول سے اس کو بالاتر لے جاتا ہے۔

میں کجی ہے وہ ان کی تاویلوں کے پیچھے پڑتے اور فتنے برپا کرتے ہیں۔ یہ متشابہات اللہ کی ذات۔ صفات۔ جنت۔ نار اور میزان عمل وغیرہ ہیں جن کا بیان تمثیل و تشبیہ کے طور پر ہے اور جن کی حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔ معتزلہ نے سب سے پہلے متشابہات ہی کو لیا اور اللہ کی ذات کو صفات سے منزہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی اور اسی کو اپنا اولین اصول "توحید" قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی سے خلق قرآن کا مسئلہ نکلا جس سے فتنہ برپا ہوگیا اور آخر اسی فتنے کی موجیں خاروخس کی طرح ان کو بہا لے گئیں۔

(۴) غلطی پر غلطی انھوں نے یہ کی کہ اس فلسفیانہ عقیدہ میں عوام کو شریک کرنا چاہا۔ اور اپنی جماعت میں سے ٹولیاں بنا بنا کر اطراف ممالک میں تبلیغ کے لئے بھیجنے لگے اور کوشش شروع کی کہ اعتزال کو حکومت کا رسمی مذہب بنا دیں۔ خلیفہ مامون اور وزیر احمد بن ابی دواد دونوں ان کے ہم خیال تھے۔ اس وجہ سے کامیابی کی امید بھی قوی تھی۔

(۵) آخر میں سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اس عقیدے کو اپنے حریفوں سے منوانے کے لئے قوت سے کام لیا۔ اور اس عقلیت پرست جماعت نے جس کو وسیع القلب ہونا چاہیئے تھا ایسی تنگ دلی اختیار کی کہ بڑے بڑے محترم بزرگان امت کو سزائیں دلوائیں۔ قید و بند میں ڈالا اور قتل کرایا۔ آخر مکافات کے اصول نے ان کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔

احمد بن ابی دواد جو مامون کے زمانے سے واثق کے عہد یعنی ۲۱۷ھ سے ۲۳۲ھ تک نہ صرف قاضی القضاۃ بلکہ عملاً وزیر بھی تھا اس تمام فتنہ کا بانی تھا ۲۳۳ھ میں اس پر فالج گرا۔ متوکل نے اس کی جگہ اس کے بیٹے ابوالولید کو مقرر کیا تھا پھر معزول کر دیا۔ اور دونوں باپ بیٹوں کی ساری ملکیت ضبط کر لی۔ سخت مصیبتیں اٹھا کر نہایت

نامرادی کے ساتھ یہ دونوں ۲۳۹ھ میں مرے۔ اور امام احمد بن حنبل نے ۲۴۱ھ میں جس دن وفات پائی اس دن بغداد میں سارا کاروبار بند ہوگیا۔ ان کے جنازہ میں جس قدر خلقت تھی اس کا شمار تیرہ لاکھ سے زائد تھا اور بالاخانوں اور شہر پناہ کے اوپر مستورات کم سے کم ساٹھ ہزار تھیں۔ حنابلہ کہتے تھے۔ بیننا و بینکم یوم الجنائز (ہمارے اور تمہارے درمیان جنازہ کے دن فرق ظاہر ہوتا ہے۔)

معتزلہ کے بعد

معتزلہ اگرچہ اپنی تباہی کے ذمہ دار آپ ہی مگر ان کے فنا ہو جانے سے امت کا عقلی اور دینی نقصان ہوا۔ محدثوں نے منقولات سے جو جمود پیدا کیا تھا اس کے مقابلے میں ان کی عقلیت نے توازن قائم کر رکھا تھا ان کے مٹ جانے سے پھر وہی جمود عود کر آیا۔ اب جو لوگ علوم عقلیہ کو لے کر اٹھے مثلاً فارابی۔ ابن سینا۔ اور ابن رشد وغیرہ وہ محدثین کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے تھے اور اسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ وہ ان کو اپنے افکار میں آزاد رہنے دیں۔ ان کی زندگیوں کا ماحصل فلسفہ تھا۔ اور معتزلہ دین کو ہر شے پر مقدم رکھتے تھے۔ اس لئے یہ لوگ اُن کی جگہ پر نہ کر سکے اور متکلمین نے تو شروع ہی سے علم کلام کی بنیاد اہل سنت کے عقائد پہ رکھی اور دینی لحاظ سے ہمیشہ محدثوں کے تابع رہے۔

مرجئہ

عہدِ صحابہ میں جب فتنہ برپا ہوا۔ اور مصریوں اور عراقیوں نے آکر مدینے میں حضرت عثمان کو قتل کر ڈالا اور حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس وقت امت میں دو مختلف الخیال جماعتیں ہو گئیں جن کو سیاسی فرقے کہنا زیادہ صحیح ہے۔ مگر اس زمانے میں جاذبۂ دینی اس قدر قوی تھا کہ ہر اختلاف دینی اختلاف بن جاتا تھا۔ چنانچہ شیعۂ علی اور شیعۂ عثمان کے دو متحارب گروہ ہو گئے۔

حضرت علی کو پہلے بصرہ میں اصحاب جمل سے لڑنا پڑا۔ پھر معاویہ سے صفین کے میدان میں۔ اسی میں تحکیم کے موقع پر خود ان کے مخلص حامیوں میں سے ایک جماعت ان سے منحرف ہو گئی یعنی خوارج۔ اور ان کو اور ان کے شیعہ کو کافر کہنے لگی۔ نہروان میں ان کے ساتھ مقابلہ پیش آیا۔ ان مخالفتوں سے شیعہ خلفاء ثلاثہ بلکہ سوائے چند کے جملہ صحابہ کو، خوارج حضرت علی اور ان کے شیعہ کو اور دونوں گروہ بنی امیہ کو کافر کہنے لگے۔ ہر فریق صرف اپنے کو حق پرست اور دوسروں کو باطل پرست سمجھتا تھا۔

اس باہمی مخالفت اور تکفیر کو امت کے ارباب بصیرت اور حقیقت شناس لوگوں نے نفرت کی نظر سے دیکھا۔ وہ خلفاء ثلاثہ کی تکفیر کیسے سن سکتے تھے جن کے ایمان اور اسلامی کارنامے سورج سے بھی زیادہ روشن تھے۔ نہ صحابۂ کرام خاص کر ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر نیز امیر معاویہ کے ایمانوں میں شک کر سکتے تھے۔ نہ خوارج اور شیعہ کو جو اللہ و رسول پر ایمان رکھتے تھے اسلام سے خارج کر سکتے تھے اور نہ بنی امیہ کو جو امت اسلامیہ کا علم اپنے کندھوں پر سنبھالے ہوئے تھے۔

باطل پرست کہہ سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے سب کو مسلمان قرار دیا اور ان کے اعمال کے محاسبہ کو حشر کے دن پر مؤخر کر کے اللہ کے حوالہ کیا۔ ارجاء کے معنی تاخیر کے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ مذہب ارجاء کے نام سے موسوم ہوا۔ اور اس کے پیرو مرجئہ کہلائے۔

صحابۂ کبار میں بھی بعض حضرات مثلاً عبداللہ ابن عمر، سعد بن وقاص اور عمران بن حصین وغیرہ ہم کو نظر آتے ہیں جو نہ صرف ان فتنوں سے خود کنارہ کش رہے بلکہ لوگوں کو تلقین کرتے رہے کہ ان سے الگ تھلگ رہیں۔ یہی وہ نمونہ تھا جس پر مرجئہ کی جماعت قائم ہوئی۔

بنیادی بحث خارجیوں نے "لاحکم الا للہ" کا نعرہ لگا کر اپنے سوا جملہ مسلمانوں کو جو حکومت کے لئے تلوار نہ اٹھائیں یا گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں، کافر کہا۔ معتزلہ نے بھی مرتکب گناہ کبیرہ کو اگر کافر نہیں تو فاسق ٹھہرایا۔ شیعہ نے امام کی معرفت اور اس کی اطاعت کو ایمان کا جزو بنا دیا۔ اس لئے ان کے نزدیک ائمہ اہل بیت پر ایمان لائے بغیر کوئی مسلمان ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ مرجئہ نے ان تمام باتوں کو غلو قرار دیا۔ انھوں نے ایمان کی بنیاد صرف "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر رکھی اور اعمال کو اس سے خارج کر دیا۔ ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو کلمہ گو ہے مسلمان ہے خواہ نکوکار ہو خواہ گنہگار۔ اعمال کا محاسبہ قیامت کے دن اللہ کے ذمہ ہے۔ انھوں نے خارجی۔ شیعہ اور بنی امیہ سب ہی کو مسلمان تسلیم کیا اور کسی کی تکفیر کر کے اس کو امت سے نکال دینا روا نہ رکھا۔ یہاں تک کہ بعض مرجئہ نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور کہہ دیا کہ دل سے ایمان لانے کے بعد کوئی زبان سے خواہ یہودی ہو جائے یا عیسائی، بت پرستی کرے یا صلیب پوجے اور اسی پر مر بھی جائے تب بھی اس کا حشر مسلمانوں ہی کے ساتھ ہوگا۔

الغرض دوسرے فرقوں نے ایمان اور اسلام کے دائرہ کو جس قدر تنگ کر دیا تھا مرجئہ نے اسی قدر اس کو وسیع کر دیا۔ انھوں نے امت پر رحمت اور شفقت کی نظر ڈالی اور آپس میں لڑ لڑ کر فنا ہو جانے سے اس کو بچانے کی کوشش کی۔

مرجئہ میں بھی دو فریق تھے ایک صرف دلی تصدیق کو ایمان قرار دیتا تھا۔ دوسرا تصدیق بالجنان کے ساتھ اقرار باللسان کو بھی جزو سمجھتا تھا۔ مگر عمل بالارکان دونوں کے نزدیک ایمان سے خارج تھا۔

یہ مسئلہ بساط بحث پر آیا۔ اور معتزلہ اور خوارج نے جو اعمال کو اجزاء ایمانی شمار کرتے تھے سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ فریقین نے اپنے اپنے دعوے پر آیات و روایات سے استدلال کیا۔ میں یہاں ان کو چھیڑوں تو اپنے موضوع سے باہر نکل جاؤں گا۔ اگر کوئی اس بحث کو دیکھنا چاہے تو امام ابوالحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کا مطالعہ کرے۔

تحدید ایمان کے بعد اس سے دوسرے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً وہ گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں۔ اعمال کو خارج کر دینے کے بعد مرجئہ عام طور پر اسی کے قائل ہوئے کہ ایمان میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی۔

مرتکب کبیرہ کو خارجی اور معتزلی ابدی جہنمی سمجھتے تھے۔ مرجئہ نے اس سے انکار کیا وہ بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی کافروں کی طرح مخلد فی النار نہیں قرار دیتے بلکہ اس کی بخشش کی امید رکھتے ہیں۔

متکلمین نے اس عقیدے کی اہمیت کا پورا اندازہ کیا لیکن ان کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ اس سے اعمال شرعیہ کی حیثیت کم ہو جائے گی اور عوام جب سن پائیں گے کہ بلا عمل کے بھی نجات کی امید ہے تو اسی پر بھروسہ کر کے سستی کرنے لگیں گے۔ اگرچہ خواص کو اس سے ضرر نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ شرعی فرائض ہیں جن کے ارتکاب پر سخت محاسبہ ہوگا۔

مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس وجہ سے سورۂ زمر کی آیت

قل یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔ إن اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔ انہ ہو الغفور الرحیم	کہدے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر (گناہ کرکے زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ وہ سارے گناہوں کو بخش دے گا۔ بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کا سہارا لے کر اسی راہ پر چل پڑے۔

لیکن جو اندیشہ تھا وہ صحیح نکلا یعنی امت سے ذوق عمل جاتا رہا۔ اور جب عمل نہیں تو نجات کہاں۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

ونودوا ان تلکم الجنۃ اورثتموہا بما کنتم تعملون	اور ان سے پکار کر کہدیا جائے گا کہ یہ جنت ہی جس کے تم وارث بنائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے میں

دراصل دین کا مقصود عمل ہی ہے۔ خود ایمان بھی عمل ہے۔ اعمال قلوب میں سے۔ زیادہ قریب الفہم الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ایمان اساس ہے جس پر تعمیر عمل صالح سے ہوتی ہے۔ اگر عمارت نہ ہو تو خالی بنیاد کیا کام دے سکتی ہے۔

مگر امت کی بے عملی کی علت محض ارجاء نہیں ہے بلکہ لامرکزیت اور مذہبی انفرادیت کو بھی اس میں دخل ہے۔ مرکز نہ ہونے کی وجہ سے اجتماعی عمل مفقود ہوا اور جب کوئی قوت مطالبہ کرنے والی نہیں رہی تو انفرادی عمل بھی رضاکارانہ رہ گیا۔

اس مذہبی انفرادیت میں بہت سے لوگوں نے جب ظاہری مہمات ملت کو سلاطین وامراء کے ہاتھوں میں دیکھا اور اپنے اوپر ان کے دروازے بند پائے تو باطن کی طرف رُخ کیا۔ اور ورد و وظیفہ اور ذکر و فکر سے اس کے تزکیہ میں مصروف ہوگئے۔ اسی راہ میں آگے بڑھ کر عجمی تصوّف سے دلچسپی ہوئی۔ جس کا اثر رفتہ رفتہ ملت کے بڑے

حصہ پڑھا گیا۔ گوشہ نشینی اور عزلت گزینی نے خانقاہی ذہنیت پیدا کی جس سے عملی قوت اور بھی مسلوب ہو گئی۔ اور رضائے الٰہی اور حصول جنت کا مدار صرف چند انفرادی اعمال پر رکھ لیا گیا۔[۵۹]

مرجیہ اور سیاست مرجیہ صلح پسند جماعت تھی کسی مسلم کو نہ کافر قرار دیتی تھی نہ کسی پر تلوار اٹھانا جائز سمجھتی تھی۔ اس وجہ سے غیر ارادی طور پر وہ سیاست کی خدمت گزار تھی۔ عہد صحابہ و نیز اس کے بعد کے متحارب فریقوں کے متعلق اس کا قول یہ تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک نے اجتہاد میں غلطی کھائی جس کی تنقیح ہمارے ذمہ نہیں ہے۔ ہر فریق اپنے وجوہ رکھتا تھا جن کو وہ اللہ کے سامنے پیش کرے گا۔ وہاں فیصلہ ہو گا۔

خلفاء بنی امیہ کو مومن اور ان کے ساتھ تعاون کو صحیح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی طرف سے کبھی کوئی گرفت نہیں ہوئی۔ عباسیہ کے ساتھ بھی ان کا رویہ یہی رہا۔ مامون الرشید کہا کرتا تھا کہ "الارجاء دین الملوک" یعنی ارجاء بادشاہوں کا مذہب ہے۔ غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہوں کو ایسا صلح کل مذہب پسند ہے اس لئے یہ جماعت پھیلی۔ مجھے ان مورخوں کے بیان پر تعجب ہے جو کہتے ہیں کہ مرجیہ بالآخر ختم ہو گئے۔ حالانکہ وہ ختم نہیں ہوئے بلکہ جملہ اہل سنت نے ان کے اکثر عقائد قبول کر لئے۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ امت نے ان کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اس نام سے کوئی مخصوص فرقہ باقی نہیں رہا۔

امام ابوحنیفہ امام ابوالحسن اشعری نیز شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ متعدد بزرگوں

---

[۵۹] تصوف کے عناصر تمام تر بیرونی ہیں مختلف اقوام میں یہ اسلام سے پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اس کی ریاضتوں سے جو صوفیانہ قوتیں پیدا ہوتی ہیں وہ تمام تر تخیلی ہیں۔ یہ دین نہیں ہے بلکہ فن ہے جس کو ہر مسلم اور غیر مسلم انھیں ریاضتوں سے حاصل کر سکتا ہے۔

نے لکھاہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب مرجیہ تھے لیکن اس الزام سے امام موصوف اور ان کے اصحاب کو ضرر کیا ہے ۔ وہ یہی تو کہتے تھے " لانکفر اہل القبلہ " یعنی ہم کسی قبلہ رُخ ہونے والے مسلمان کو کافر نہیں کہتے ۔ علماء اہل سنت میں سے کون صاحب بصیرت ایسا ہے جو اس سے انکار کر سکے ۔ ہاں ایمان کے نہ گھٹنے اور بڑھنے کا مسئلہ جو مذہب ارجاء نے پیدا کیا تھا اس کی نسبت جو ائمہ حنفیہ کی طرف کی جاتی ہے وہ محتاج ثبوت کی محتاج ہے ۔ کم سے کم امام اعظم کے متعلق میں اس قول کو صحیح نہیں سمجھتا ۔ کیونکہ آیات میں جا بجا ایمان کی کمی اور زیادتی کا ذکر ہے اور امام ابو حنیفہ سے بڑھ کر کون قرآن کا راز داں ہو گا ۔

علوم اسلامیہ

میں یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ خلفاء راشدین میں امت کی سیاسی مرکزیت بھی تھی اور اور دینی مرکزیت بھی۔ ہر قسم کے اجتماعی مقاصد کی تشکیل وہی کرتے تھے۔ اور جملہ دینی مہمات انھیں کے یہاں طے کئے جاتے تھے۔ اس وجہ سے امت میں نہ سیاسی تفرقہ تھی نہ مذہبی لیکن ان کے بعد خلفاء بنی امیہ نے ملک، فوج اور خزانہ پر قبضہ کرکے سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھی اور دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے ہاتھوں میں آگئی۔ ہر مقام کے اہل علم وہاں کے لوگوں کی رہنمائی کرنے لگے۔ ان میں اختلافات واقع ہونے شروع ہوئے جن کے فیصلے کے لئے کوئی مرکز نہ تھا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مرکز بنائی گئی اور ہر مسئلہ اور ہر اجتہاد کی تائید کے لئے روایت کا سلسلہ نکالا گیا۔

بنی امیہ کے زمانے میں قرب عہد صحابہ اور سادہ زندگی ہونے کے باعث اختلافات بھی کم تھے اور روایتیں بھی کم تھیں لیکن عہد عباسی میں جب علوم دخیلہ عربی میں منتقل ہوئے، عجمی اقوام سے اختلاط ہوا اور مختلف اہل مذاہب سے واسطہ پڑا اس وقت بہت سے جدید مسائل اور معاملات سامنے آئے اور روایات نے بڑھتے بڑھتے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی۔ اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے یہی پیشہ اختیار کر لیا۔ چونکہ روایت کے لئے کسی قابلیت یا معیار علم کی شرط نہیں تھی اس وجہ سے ہر شخص جس میں ذرا بھی دین داری ہوتی اس میں حصہ لے کر دینی بزرگی اور دنیاوی عزت حاصل کرتا۔

قرآن کو خلفاء بنی امیہ (بجز حضرت عمر بن عبد العزیز) اور خلفاء بنی عباس نے جو در اصل مستبد سلاطین تھے اپنی مخصوص سیاست سے متروک کر رکھا تھا۔ اب ان

راویوں نے دینی حیثیت سے بھی اس کو روایتوں کے اندر دفن کر دیا۔ اس کی تشریح وتفسیر بھی ان ہی سے کرنے لگے اور حدیث کا تسلط یہاں تک بڑھ گیا کہ امام اوزاعی متوفی ۱۵۷ھ نے کہا کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی اور امام یحییٰ بن کثیر نے کہا کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔ روایتوں سے قرآن کے عام کو خاص۔ خاص کو عام۔ مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید بلکہ اس پر اضافے بھی کرنے لگے۔ نیز بعض ائمہ فقہ نے روایات سے آیات کو اصولاً منسوخ کرنے کا فتویٰ دیدیا۔ اس طرح پر قرآن کے استقلال کو مٹا کر اس کو حدیثوں کا ماتحت بنا دیا جس کی بدولت دین خالص قرآنی نہیں رہا بلکہ روایاتی ہوگیا اور اس میں سینکڑوں باتیں ایسی داخل ہوگئیں جن کا نام ونشان بھی قرآن میں نہیں ہے۔

روایات کے اختلافات کے باعث امت میں دینی لحاظ سے انتشار پیدا ہوا جو برابر بڑھتا گیا علوم اسلامیہ جس سے میری مراد تفسیر۔ حدیث اور فقہ ہیں اس کا مظہر بن گئے مختلف قسم کی جماعتیں پیدا ہوگئیں جو اپنے خیالات وعقائد کے ماتحت نئے نئے اسلوب سے آیات کی تاویلیں کرنے لگیں اور روایات میں بھی وضع اور کذب سے کام لینے لگیں ان کے علاوہ سیاسی فرقے آیتوں کی تشریح اور حدیثوں کی روایت اپنے مقاصد اور اغراض کے مطابق کرتے تھے اور ان کے اوپر کوئی احتساب نہ تھا۔ اس وجہ سے حدیث کا بڑا حصہ نہ صرف غلط بلکہ امت کے لئے مضر ہوگیا۔

انھیں روایات سے قرآن کی تفسیریں کی گئیں جو جانچنے کے بعد عام طور پر ضعیف بلکہ موضوع نکلیں۔ پھر انھیں دونوں سے فقہ مرتب ہوئی جو اختلاف روایات وتاویلات کے باعث ایک نہیں بلکہ کئی ایک ہوگئی۔

ان علوم میں سے تفسیر وحدیث کے متعلق میں الگ الگ مبسوط مقالے لکھ چکا ہوں جو ادارہ طلوع اسلام دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کو یہاں دہرانا

پسند نہیں کرتا۔ ہاں فقہ کے بارے میں اب تک کچھ نہیں لکھا ہے۔ لہٰذا اس پر ایک سرسری تنقیدی نگاہ ڈالنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔

فقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ مکرمہ میں گزارے پھر ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے اور دس سال وہاں رہے۔ مکہ میں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں توحید کی دعوت، مکارم اخلاق کی تعلیم۔ شرک و کفر کی تردید وغیرہ کی آیتیں نازل ہوتی رہیں۔ شرعی مسائل نہیں تلقین کئے گئے بعض امور مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھی اترے تو ان کی اس قدر تفصیل نہیں کی گئی جس قدر مدینے میں آکر ہوئی۔ وجہ ظاہر ہے کہ قوانین کی احتیاج اس وقت ہوتی ہے جب جماعت بن جائے۔ مدینے میں آکر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی۔ اس لئے ضوابط کی ضرورت پڑی جن کی اصولی تعلیم قرآن میں دی گئی۔

یہ قانونی یا فقہا کی زبان میں احکامی آیتیں زیادہ نہیں ہیں۔ قرآن کی کم و بیش چھ ہزار آیتوں میں سے صرف دو سو آیتیں تشریعی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ تعداد بڑھا کر پانسو تک پہنچا دی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی آیات کو احکامی قرار دینے میں غلو سے کام لیا ہے۔

اکثر یہ آیتیں ضرورت پیش آنے پر اترتی تھیں۔ رسول اللہ ان کی رو سے احکام دیتے یا فیصلے کرتے تھے۔ بعض آیات میں جزئی احکام بھی ہیں مگر زیادہ تر ایسی ہیں جو اصول کا حکم رکھتی ہیں جن کی تفصیل یا تشکیل آنحضرتؐ اپنے قول یا عمل سے کرتے تھے مثلاً نماز کا حکم قرآن میں ہے لیکن اس کی عملی تشکیل رکعتوں کی تعداد اور اوقات کی تعیین وغیرہ رسول اللہ نے فرمائی۔ اسی طرح زکوٰۃ کا حکم مطلق ہے۔ یہ اس کا نصاب۔

اس کی مقدار اور ادائگی کی مدت حضور نے معین کی یہی صورت روزہ۔ حج۔ نکاح۔ طلاق وغیرہ کے احکام کی ہے۔ اس طرح پر امت کے پاس شریعت کے لئے دو چیزیں ہو گئیں احکامی آیات اور رسول اللہ کی استنباطات۔ جن کو فقہ کی اصطلاح میں کتاب وسنت کہتے ہیں[1]۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہر قسم کی ضروریات نہ پیش آسکتی تھیں نہ ان کے لئے احکام دیئے جاسکتے تھے۔ اس لئے کتاب وسنت کو اصل قرار دے کر آئندہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا گیا کہ اگر ان دونوں میں کسی پیش آنے والی ضرورت کے بارے میں حکم نہ ملے تو خلیفہ یا امیر کو اہل علم کے مشورے سے غور و فکر کے بعد نظائر پر قیاس کرکے اپنی عقل سے حکم نکالنا چاہئے۔ اس لئے تشریع میں تیسری چیز قیاس یا رائے ہوئی۔ اجماع اکثریت کے اتفاق آراء کا نام ہے۔ وہ رائے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔

فقہ صحابہ رائے کا استعمال نہ صرف ضرورتاً بلکہ عقلاً ناگزیر ہے کیونکہ قرآن کا خطاب انسانی عقل ہی سے ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے بعد ہی صحابۂ کرام کے سامنے خلافت کا اہم مسئلہ پیش آیا جس کے بارے میں نہ کوئی تصریح کتاب میں تھی نہ سنت میں۔ اس وقت انھوں نے رائے سے کام لیا اور معاملے کو اپنی عقل سے سلجھایا۔ سقیفہ بنی ساعدہ ان کے استعمال رائے کا سب سے پہلا مظہر تھا۔ اس کے بعد مرتدین عرب سے جہاد کا فیصلہ بھی رائے ہی سے کیا۔ پھر مہاجرین و انصار کے وظائف کا معا[2]

---

[1] یہاں سنت سے آنحضرتؐ کا ہر قول و فعل مراد نہیں ہے بلکہ وہ اقوال و اعمال مراد ہیں جن کی اصولی تعلیم قرآن میں ہے اور ان کی تفصیل یا تشکیل حضور نے فرمائی ہے۔ یہ سنت امت میں عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جو یقینی اور دینی ہے اور ان کے متعلق جو روایات ہیں وہ تمام تر ظنی ہیں ان کی قبولیت قرآن یا عمل متواتر کے موافق ہونے کی وجہ سے ہوگی۔

پیش ہوا۔ اس میں بھی اختلاف رائے ہوا۔ صدیق اکبر مساوات چاہتے تھے۔ حضرت عمر کہتے تھے کہ جن لوگوں نے نبی اور اسلام کی خاطر گھر بار چھوڑا ان کو زیادہ ملنا چاہئے۔ انھوں نے فرمایا کہ ان کا عمل اللہ کے لئے تھا جس کا اجر آخرت میں ملے گا۔ دنیاوی گزارے میں امتیاز قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے سب کا وظیفہ مساوی رکھا حضرت عمر نے اپنے عہد میں طبقات کے لحاظ سے تقسیم کی۔ پھر حضرت علی نے خلیفہ ہونے کے بعد اس تفریق کو مٹا دیا۔

خلفاء راشدین میں سے حضرت عمر کے تفقہ میں رائے کا استعمال بہت نمایاں ہے وہ غیر مصرح احکام کے استنباط میں علماء صحابہ سے مشورے بھی لیتے اور بحثیں بھی کرتے تھے۔ صوبوں سے جو سوالات آتے ان میں بھی لوگوں سے استفسار کرتے۔ اور بعض کا جواب مہینوں کی بحث و تمحیص کے بعد دیتے۔

یمن کے والی نے ایک مقتول کے مقدمے میں جس کو دو شخصوں نے مل کر قتل کیا تھا ان کو لکھا کہ دونوں سے قصاص لیا جائے یا صرف ایک سے؟ وہ جواب میں متردد تھے حضرت علی نے کہا کہ فرض کیجئے چند آدمیوں نے مل کر ایک اونٹ چرایا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر بانٹ لئے۔ کیا آپ ان سب کے ہاتھ نہیں کاٹیں گے؟ حضرت عمر نے فرمایا کہ کیوں نہیں۔ بولے کہ بس یہی صورت یہاں ہے۔ دونوں قتل میں شریک ہیں دونوں قصاص کے سزاوار۔ اب انھوں نے والی کو لکھا کہ دونوں کو قتل کر دو بلکہ اگر صنعاء کے کل باشندے اس قتل میں شریک ہوتے تو میں سب سے قصاص لینے کا حکم دیتا۔

اسی طرح شراب خوری کی سزا جو نہ کتاب میں ہے نہ سنت میں جب متعین کرنی چاہی تو حضرت علی نے رائے دی کہ اس پر مفتری کی حد جو قرآن میں ۸۰ کوڑے ہے قائم کرنی چاہئے کیونکہ مدہوش ہذیان بکتا ہے اور ہذیان میں افترا بھی ہوتا ہے حضرت عمر نے اس توجیہ کو پسند کیا اور یہی حد مقرر کر دی

وہ فقہ میں علت حکم کی مصلحت کو بنیادی شے قرار دیتے تھے اور تفریع میں اسی کا لحاظ
رکھتے تھے۔ قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے۔ اب یہ
دیکھنا کہ تالیف قلب کا صیغہ کہاں اور کب تک مناسب ہے مرکز کے اختیار تمیزی پر ہے۔
رسول اللہ نے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو جو امراء قبائل تھے ایک بار تالیف
قلب کے لئے سو سو اونٹ دئے تھے۔ پھر خلیفۂ اول کے عہد میں بھی ان دونوں نے
آکر کچھ زمینیں طلب کیں۔ انھوں نے ان کے نام لکھ دیں۔ حضرت عمر نے اپنے زمانہ
میں ان اراضی کو واپس لے لیا اور فرمایا کہ اللہ نے اسلام کو قوت دے کر اب تمہاری
مدد سے اس کو بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ زمین ان کے حقداروں کو دی جائے گی اور
تم نہ مانو گے تو تلوار سے فیصلہ ہوگا۔

اسی طرح قرآن نے حکم دیا ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں لیکن چور کا اطلاق
کس کے اوپر ہوتا ہے اس کی تعیین قانون ساز جماعت پر چھوڑ دی ہے۔ چنانچہ
حضرت عمر نے قحط سالی میں ان لوگوں کو جو بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کے لئے کوئی
چیز چرا لیتے تھے قطع ید کی سزا نہیں دی کیونکہ ان کی رائے میں وہ چور نہیں تھے۔
ایک بار حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک شخص کا اونٹ
چرا کر کھا لیا۔ جب حضرت عمر کے سامنے پیش کئے گئے تو اعتراف کیا۔ مگر علت وہی
بھوک تھی۔ اس لئے ان کے ہاتھ نہیں کاٹے بلکہ حاطب کے بیٹے عبدالرحمٰن کو بلا کر
کہا کہ مجھے معلوم ہوا کہ تم لوگ ان غلاموں سے کام لیتے ہو اور کھانے کو نہیں دیتے ہو۔
اگر یہ شکایت آئندہ میرے پاس آئی تو میں تم کو ایسی سزا دوں گا کہ یاد رکھو گے۔

رائے کی اہمیت

یہ مثالیں میں نے اس لئے بیان کیں کہ معلوم ہو جائے کہ خلفا
راشدین رائے کا استعمال کہاں اور کس طرح کرتے تھے۔
اور ان کے نزدیک اس کی کس قدر اہمیت تھی۔ وہ خود سوچتے۔ دوسروں سے

مشورے لیتے اور بحثیں بھی کرتے تھے۔ چونکہ ہمارے عقیدے میں یہ حضرات معصوم نہ تھے۔ اس وجہ سے بعض بعض مسائل میں ہم کو ان کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمر نے وراثت میں عول کا قاعدہ جاری کیا۔ جب ان کے سامنے فرائض کے ایسے مسائل پیش ہوئے جن میں مخرج ورثہ کے سہام معینہ سے کم تھا تو انھوں نے حضرت زید بن ثابت سے جو صحابہ میں فن وراثت کے سب سے بڑے ماہر تھے مشورہ کیا۔ بالآخر اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ مخرج کو بڑھا کر کمی حیلہ ورثہ پر ڈال دی جائے۔ اسی کو عول کہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے۔

زینب ۔ مسلہ ۶ ۔ عول ۱۰

شوہر ۳ ماں ۱ دو حقیقی بہنیں ۴ دو اخیافی بہنیں ۲ ۔ فقہا کے نزدیک اس صورت میں قرآن کی رو سے شوہر کا حصہ نصف ہے۔ ماں کا سدس۔ دو حقیقی بہنوں کا دو ثلث اور دو اخیافی بہنوں کا ایک ثلث۔ اس لئے مسلہ ۶ سے ہوا۔ لیکن جب اس کو حصہ داروں میں تقسیم کیا تو مجموعہ ۱۰ ہوگیا۔ اب ہر ایک وارث کو ۶ میں سے جس قدر ملنا چاہیے تھا دس میں سے ملا۔ اس طرح کمی تو پر نہ رسدی سے سب کے حصہ میں آگئی مگر ہوگئی قرآن کی مخالفت۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ سوچ کر کہ کیا قرآن کا اُتارنے والا پروردگار (نعوذباللہ) حساب سے ناواقف ہے۔ آیات وراثت میں زیادہ غور کیا تو اصل حقیقت ان کے اوپر ظاہر ہوگئی کہ دو مختلف تقسیمیں ہیں جن کو ایک کر دینے سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ ورنہ عول قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس پر مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ زفر بن حارث نے ان سے کہا کہ جب یہ مسلہ آپ کی سمجھ میں آگیا تھا تو آپ نے حضرت عمر کو سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ بولے کہ ان کے رعب سے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

کاش انھوں نے سمجھایا ہوتا ممکن تھا کہ حضرت عمر مان جاتے۔ پھر نہ فقہ کے ائمہ
اس کو اختیار کرتے نہ آج تک یہ امت میں چلا آتا[1]۔ اسی طرح جد کی توریث میں بھی وہ کسی
نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ بلکہ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق زندگی بھر اس میں مختلف فیصلے
کرتے رہے بعض روایات سے جو میرے نزدیک مشتبہ ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت
عمر نے تین طلاقوں کو جو یک وقت دی جائیں طلاق بائنہ قرار دیا۔ یہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔
لیکن یہ غلطیاں اجتہادی ہیں ان سے کوئی مجتہد بچ نہیں سکتا۔ بیشک بعد والوں کا
فریضہ تھا کہ تصحیح کرتے۔ مگر انھوں نے تنقیدی نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کی۔ حالانکہ قرآن کا
ایک حرف بھی اپنی جگہ قائم کرنا سب سے بڑی دماغی نعمت اور حق کی عبادت ہے۔
اجتہاد اور تفریع مسائل میں صحابۂ کرام میں حضرت علی۔ زید بن ثابت۔ ابوموسیٰ اشعری
ابی بن کعب اور معاذ بن جبل وغیرہ خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے۔ عہد فاروقی میں
فتوحات کا دائرہ وسیع ہو جانے کی وجہ سے سینکڑوں قسم کے جدید جہات مسائل پیش
آئے جن میں یہ حضرات خلیفہ کے اجتہاد میں مدد دیتے تھے۔ یہ طرز عمل صالح تخم تھا جس
سے آئندہ قانون ساز جماعت بن جاتی اگر استبداد نہ مسلط ہو جاتا۔

حضرت عمر نہ صرف شرعی بلکہ اقتصادی اور عمرانی امور میں بھی رائے سے کام لیتے
تھے۔ انھیں کے شیدائی اور شاگرد خاص حضرت عبداللہ بن مسعود تھے جو عراق کے دینی
معلم تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے فقہا جن کی امامت ابوحنیفہ پر منتہی ہوئی اصحاب
رائے کہے گئے۔ ابوحنیفہ حماد کے شاگرد تھے اور حماد ابراہیم نخعی کے نخعی نے علقمہ سے
اخذ کیا جو ابن مسعود کے تلمیذ خاص تھے۔

مذاہب اربعہ | فقہ میں اہل سنت کے گو چار مذاہب مشہور ہیں حنفی۔ شافعی۔ مالکی

---

[1] اس مسئلہ کو دلیل اور تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی عربی کتاب الوراثۃ فی الاسلام میں لکھ دیا ہے جو کہ
جامعہ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

اور حنبلی۔ لیکن علمی لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ صرف دو ہی مذاہب ہیں۔ اصحاب رائے اور اصحاب حدیث۔ جہاں تک میری سمجھ میں آسکا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب دینی لامرکزیت پیدا ہوگئی اس وقت مدینہ میں محتاط صحابہ کی ایک جماعت صرف حدیثوں پر عمل کرنے لگی۔ اکثر تابعین بھی اسی خیال کے ہوئے۔ ان کو جن مسائل میں کوئی آیت یا روایت نہ ملتی خاموش رہتے اور رائے کو مکروہ سمجھتے۔ سالم بن عبداللہ بن عمر سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ فرمایا کہ اس بارے میں مجھے کوئی حدیث نہیں پہنچی ہے۔ اس نے کہا اپنی رائے سے جواب دیجئے بولے کہ ممکن ہے کل وہ رائے بدل جائے پھر میں تم کو کہاں ڈھونڈھتا پھروں گا۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل سے ان کے بیٹے عبداللہ نے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ ہو جہاں اصحاب رائے ہوں لیکن ایسا محدث نہ ہو جو رطب و یابس میں تمیز کرسکتا ہو تو کیا کرے۔ بولے کہ محدث ہی سے پوچھے اور اصحاب رائے کے پاس نہ جائے۔ ضعیف حدیث بھی رائے سے بہتر ہے۔

اس طرح یہ لوگ رائے سے تو بچے رہے لیکن ضرورتوں کو کیسے روک سکتے۔ اس کا بلا ارادہ نتیجہ یہ ہوا کہ حدیثیں بنائی گئیں اور اس کثرت سے کہ پھر رائے کی حاجت کم رہ گئی۔

مدینہ کے امام، مالک بن انس تھے۔ ان کے شاگرد تھے شافعی اور شافعی سے احمد بن حنبل نے اخذ کیا۔ اس طرح یہ تینوں مذاہب تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ امام مالک اور شافعی بھی رائے اور قیاس کو استعمال کرتے تھے لیکن واقعات میں۔ مفروضات میں نہیں اور نہایت احتیاط کے ساتھ بشرطیکہ مبنے کوئی مستند روایت ہو۔ اور حنبلی مذہب کی بنیاد تو تمامتر حدیث ہی پر ہے۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ امام اوزاعی اور داؤد ظاہری کے مذاہب جو اس سے قریب تر تھے

اسی میں جذب ہو کر رہ گئے۔

عراقی مذہب کے بھی ایک بڑے رکن امام محمدؒ نے امام مالک کی شاگردی کی تھی۔ لیکن یہاں تفریع مسائل کے جو اصول ابراہیم نخعی کے زمانے سے بن چکے تھے اُن کے مطابق رائے کا استعمال برابر جاری رہا۔ اس وجہ سے فقہا کے دو نمایاں گروہ ہو گئے۔ اصحاب حدیث و اصحاب رائے جن میں باہم اختلافات بھی تھے اور مخالفت بھی۔

عراقی فقہ

عراقی فقیہوں کی جماعت اپنے قاعدوں کے مطابق قیاس کو آزادی کے ساتھ استعمال کرتی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ ان میں اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی۔ حجازی فقیہوں میں بھی اختلافات ہیں مگر کم۔ بلکہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں بھی اس قدر اختلافات نہ ہوں گے جس قدر کہ خود فقہائے عراق میں ہیں جس کے وجوہ یہ ہیں:-

(۱) قیاسات کا مدار فکر پر ہے اور سب کا طریق فکر نہ ایک تھا نہ ایک ہو سکتا تھا چنانچہ خود صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد میں جو ایک ہی اُستاد کے شاگرد اور ایک ہی طریق فکر و اصول کے پیرو ہیں بیشمار اختلافات ہیں۔

(۲) یہ لوگ مفروضات میں گھس جاتے تھے یعنی ہر ایک مسئلہ کی جتنی خیالی شکلیں ہو سکتی تھیں سب کو معرض بحث میں لاتے تھے جن کے جوابات مختلف ہوتے تھے۔ ایک مسئلہ کا حکم نکالتے پھر اُستاد سے "ارایت لوکان کذا" (دیکھئے تو اگر صورت یوں ہو) کہہ کر اس صورت کو حل کرتے۔ اصحاب حدیث اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ امام شعبی نے کہا کہ ان لوگوں سے مجھے اتنی نفرت ہے کہ مسجد میں آتے ہوئے کوفت ہوتی ہے کسی نے پوچھا کن لوگوں سے؟ بولے ان آرائیتیوں سے۔

امام مالک کی محفل بہت باوقار تھی۔ ان سے کسی کو سوال کرنے کی جرأت مشکل سے ہوتی تھی۔ اسد بن الفرات نے ایک بار کوئی سوال کیا۔ امام موصوف نے اس کا جواب دیا۔ پھر اُنھوں نے پوچھا کہ اگر شکل یہ ہو۔ بولے کہ یہ سلسلہ بنت سلسلہ ہے۔ اگر

اس کے خواہشمند ہو تو عراق چلے جاؤ۔

اس زمانے میں حدیث کا غلبہ اس قدر تھا کہ بلا روایتی سند کے کسی کے قول۔ استنباط یا اجتہاد کی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ عراقی فقہا بھی مسائل میں اپنی رایوں کی تائید کے لئے حدیثیں پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔ مگر ان کی بہت سی روایتیں ایسی ہیں جن کی زبان تک بھی محدثانہ نہیں بلکہ فقیہانہ ہے۔

امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف بغداد کے قاضی القضاۃ ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی قابلیت سے فقہ حنفی کو دولت عباسیہ کا رسمی قانون بنا دیا جس کے باعث اس میں بہت وسعت پیدا ہو گئی اور مدت دراز تک مشرقی ممالک میں اسلامی ذہنیت کا ساتھ دیتی رہی۔ علامہ ابن خلدون نے افریقہ اور اندلس میں مالکی مذہب کے پھیلنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ ان ممالک میں بداوت تھی اور ان کے باشندے اس تہذیب سے جو عراق میں تھی نا آشنا تھے، اس وجہ سے مالکی مذہب جو سادہ اور ان کی طبائع کے مناسب حال تھا ان میں مقبول ہوا۔

اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ امام جس شہر کا ہوتا ہے اس کی بداوت یا حضارت کا اثر نہ صرف اس کی فقہ بلکہ اس کی رائے کی تکوین پر بھی پڑتا ہے حالانکہ فقہ کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے جو مقامی اثر سے بالاتر ہے۔

بیشک حنفی فقہ میں بعض بعض مسائل میں وسعت اور رخصت نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ نماز کو فارسی میں بھی پڑھنے کی اجازت دیتی ہے اور قرآن کی تلاوت کو دوسری زبانوں میں بھی مباح کرتی ہے۔ اسی طرح عاقل بالغ عورت کو بلا ولی کے نکاح کا اختیار دیتی ہے اور امام مالک اور شافعی ان امور کو روا نہیں رکھتے۔ مگر اسی کے ساتھ اس میں کہیں کہیں تنگی اور سختی بھی ہے۔ مثلاً اس میں نکاح کے معاملے میں کفارت کا اعتبار کیا گیا ہے کہ قریش فلاں قبیلہ کے کفو ہیں اور عجمی نو مسلم عرب کے کفو نہیں ہیں۔ اس کفارت نے اسلامی

برادری کی وسعت کو مٹا دیا اور اس کی اشاعت میں رکاوٹ کا موجب ہوئی۔ بہت سے گھرانے آسانی سے اسلام لانے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں اگر ان کو یقین ہو جائے کہ ان کی بیٹیاں اچھے گھروں میں جا سکیں گی۔ بخلاف اس کے مدنی فقہ میں سارے کلمہ گو ہم کفو تسلیم کئے گئے ہیں۔ اسی طرح حنفی فقہ نے عورتوں کے حق خلع کو ضبط کر لیا جس کے نتائج ہند میں ہمارے سامنے ہیں کہ مسلمان بیویاں اپنے شوہروں کے مظالم سے تنگ آکر جب رہائی کی کوئی صورت نہیں دیکھتی ہیں تو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

اس لئے علامہ موصوف کی یہ رائے فقہوں کے تقابلی مطالعہ پر نہیں بلکہ محض قیاس پر مبنی ہے۔ بے شک امام ابو حنیفہ کے اقوال عام طور پر قرآن کے مطابق ہیں حنفی فقہ سے ان کو نکال لینے کے بعد اس کا بقیہ حصہ سب فقہوں سے زیادہ ترمیم کے قابل ہے۔

متاخرین فقہاء حنفیہ نے تو خیالی تفریعوں اور قانونی موشگافیوں میں اس قدر غلو کیا ہو کہ ابواب نکاح و طلاق میں ان کی نفظی بحثیں عقل و علم کی حد سے آگے بڑھ گئی ہیں اور کتاب الحیل جس میں نہ صرف ضمیر کو دھوکا دینے بلکہ شرعی قوانین کو بیکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے تقوے کے خلاف ہے[۱]۔

تقلید ہر صاحب نظر اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قانون سازی کا حق صرف مرکزی جماعت کو ہے۔ اسی کا بنایا ہوا قانون پوری امت کا قانون ہوتا ہے۔ لیکن خلافت راشدہ کے بعد جب امت کی دینی مرکزیت جاتی رہی تو اس مذہبی انفرادیت میں علماء نے شخصی فقہیں مرتب کیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا خلوص اور تقویٰ کے ساتھ کیا۔ ان کی شخصیتیں اس قدر محترم تھیں کہ خلفاء کو جب تک کہ ان کی سیاست

---

[۱] اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو علامہ ابن القیم کی کتاب اعلام الموقعین مطالعہ کیجئے جو دو ضخیم جلدوں میں اسی عنوان پر ہے۔

زد نہ پڑتی ہو کبھی ان کے مسائل میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوئی ۔ امام مالک کو جو مجبور کی طلاق کو نا جائز کہتے تھے عباسی خلیفہ نے کوڑوں سے پٹوایا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ مسئلہ غلط تھا بلکہ اس سے مجبور کی بیعت خلافت نا جائز قرار پاتی تھی ۔

ان فقہائے کرام کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی بنائی ہوئی فقہوں کو لوگ الگ الگ مذہب بنا لیں ۔ اس لئے ان کے بعد کے علماء کا فریضہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا پیشوا مان کر ان کے اجتہادوں میں امتزاج پیدا کرتے اور سب کی فقہوں کو ملا کر ایک فقہ بنا لیتے لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ ہر فقہ کے پیروؤں نے رفتہ رفتہ اسی کو اپنا مذہب بنا لیا اور دوسرے ائمہ کی فقہوں کو چھوڑ دیا ۔ اس تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں تفریق اور نزاع بڑھتی گئی بالآخر یہ طے کیا گیا کہ چاروں مذاہب حق ہیں ۔ مگر اس کا مفہوم یہ رکھا گیا کہ حنفی مذہب حنفیوں کے لئے اور شافعی مذہب شافعیوں کے لئے حق ہے ۔ ایک کو دوسرے کی فقہ کے مطابق فتویٰ دینا روا نہیں ۔ اس سے نزاع تو کم ہو گئی مگر تفریق بدستور باقی رہی جو آج تک قائم ہے ۔ ہر ہر فرقہ کے امام الگ ہیں ۔ علماء الگ ہیں ، کتابیں الگ ہیں گویا ہر فقہ ایک مستقل مذہب ہے اور ہر ایک کے پیرو ایک مستقل امت ۔ یہاں تک خانہ کعبہ میں چار مصلے بھی الگ الگ تعمیر کئے گئے جو امت کے مذہبی تفریق کے مظاہر ہیں ۔ اور جن کو دیکھ کر ہر صاحب بصیرت اور دردمند مسلمان کو قلق ہوتا ہے ۔

شیعی فقہ

شیعی حدیث و فقہ کا بڑا مرجع امام جعفر صادق کی ذات ہے ۔ بلکہ انھیں کی نسبت سے یہ مذہب جعفری کہا جاتا ہے ۔ وہ نہ اجماع کو صحیح سمجھتے تھے نہ قیاس کو ۔ اس لئے اس فقہ کا تمام تر دار و مدار کتاب و سنت پر ہے ۔ چونکہ شیعوں کی حدیث اپنے ائمہ کے متعلق مخصوص عقائد رکھنے کی وجہ سے سنیوں سے مختلف ہے اس وجہ سے ان کی فقہ بھی الگ ہو گئی ۔

یوں تو فریقین کے اختلافی مسائل بہت ہیں جن کا شمار مشکل ہے ۔ لیکن تین مسئلوں

ہیں اہل سنت سے الگ ہوکر شیعوں نے اپنے فرقہ کا امتیاز قائم کیا ہے

(۱) وضو میں پاؤں کو دھونے کے بجائے ان پر مسح کرتے ہیں۔

(۲) اذان میں حی علی الفلاح کے بعد حی علی خیر العمل پکارتے ہیں۔

(۳) متعہ کو جائز سمجھتے ہیں جو سنیوں کے ہاں شرع سے بالاتفاق حرام ہے۔

متعہ یہ ہے کہ ایک معین مہر پر معین مدت کے لئے نکاح کیا جائے۔ اس میں نہ تعداد کی حد ہے نہ گواہ کی ضرورت۔ نہ وراثت ہے نہ طلاق۔ مدت گزر جانے پر نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

شیعہ نے یہی کوشش کی کہ خانہ کعبہ میں ایک مصلی مذہب جعفری کا قائم ہو جائے نادر شاہ ایرانی سالہا سال تک سلاطین عثمانیہ کو لکھتا رہا۔ مگر سلطان محمود خاں اور ترکی کے شیخ الاسلام نے نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی نہ کعبے میں اس کا مصلی منظور کیا۔

خلاصہ

ہم نے قرآنی تعلیمات سے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ اسلام کا اصل مقصود یہ ہے کہ جملہ بنی نوع انسان اکیلے اللہ کے بندے اور باہم بھائی بھائی ہو کر سب کے حقوق مساوی ہوں۔ کوئی کسی پر حکمران نہ ہو اور سارا انتظام قوانین الٰہی کے ماتحت ہو۔

حکومتِ الٰہی

آنحضرت نے اپنے زمانے میں جس طریق پر اُمت کو چلایا اس کے متعلق کچھ لکھنا ہی غیر ضروری ہے۔ وہ تو خالص پیغمبرانہ تعلیم اور مربیانہ تربیت تھی جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آپ کا ۲۳ سالہ عہد نبوت گویا ۲۳ موتیوں کی مالا ہے جو زمانے کی گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ آپ کی صحبت کے فیض سے صحابۂ کرام نے خلافت کو انھیں اصول پر قائم کیا۔ خلیفہ میں شاہانہ تمکنت اور حکومت کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی سڑکوں پر پیدل پھرتا تھا۔ نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے نہ نقیب۔ سب لوگ اس سے ملتے اور سب سے وہ ملتا۔ اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں بجز عہدۂ خلافت کے کوئی امتیاز نہ تھا۔ نہ اس کو اس قسم کی دینی ریاست حاصل تھی کہ جب چاہے حکم دے دے۔ دینی مذہبی مسئلہ ہو جائے۔ بلکہ صرف احکام دینی کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

اس خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا۔ اس تیس سال کے عرصے میں مسلمانوں کو وہ سربلندی نصیب ہوئی کہ ترکستان سے بحر خزر تک اور افریقہ میں تیونس تک اسلام پھیل گیا۔ اور قوت اس قدر زبردست ہو گئی کہ روئے زمین پر کسی کو ان سے ٹکرانے کا یارا نہ رہا۔ یہ تمام آسمانی برکتیں اور فتوحات اور امتِ اسلامیہ کی یہ

یہ عظمت و شان اس وجہ سے تھی کہ سب اسلامی نظام میں منسلک اور اکیلے اللہ کے بندے تھے خلیفہ کی ذات میں ان کی مرکزیت تھی جس کی وجہ سے ان کے ملی مقاصد متعین تھے۔ اور ساری امت ایک محور پر گھومتی تھی۔ وہ نہ صرف خود بھائی بھائی تھے بلکہ ساری دنیا کی قوموں کے لئے انھوں نے حکومت الہٰی کا سامان اور ملجا تیار کر دیا تھا کہ جو چاہے اس میں آکر ان کا بھائی بن جائے اور مساوی حقوق لے۔

عہد بنی اُمیّہ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور آیا جو ۲۵ ربیع الاول ۴۱ھ سے جس دن امیر معاویہ کے ہاتھ پر خلافت کی عام بیعت ہوئی شروع ہوا۔ اس دور میں بھی جو ۹۲ سال رہا امت ایک ہی جھنڈے کے نیچے تھی ان خلفاء کی ذات میں بھی اُمت کی سیاسی مرکزیت قائم رہی۔ اور خواہ وہ کیسے ہی رہے ہوں اسلامی قوت اور شوکت کو انھوں نے سنبھالے رکھا بلکہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تو فتوحات کے حدود مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک پہنچ گئے تھے۔ اور بری فوجوں کے علاوہ ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی تھا جس نے سطح آب پر کئی بار رومیوں کو شکستیں دی تھیں۔ دولت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ ہر ایک اندھے اور جذامی کو ایک ایک خادم دیا گیا تھا جس کے اخراجات بیت المال سے ملتے تھے۔ اور اہل نصاب راتوں کو اشرفیاں لے کر گھومتے تھے مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

استبداد مگر باوجود ان خوبیوں کے مرض پیدا ہو چکا تھا یعنی استبداد۔ وہ استبداد جو اقوام اُمم کے لئے ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اس کا پہلا مظہر خود ان کی خلافت تھی۔ خلفاء راشدین میں سے اگرچہ ہر ایک کی نوعیت انتخاب جداگانہ تھی مگر مشورہ اور بیعت عامہ یعنی جمہوریت کی روح ہر ایک میں موجود تھی۔ لیکن امیر معاویہ جو خلافت بنی امیہ کے بانی ہیں۔ ان کا انتخاب عام نہیں ہوا تھا۔

صرف اہل شام نے ان کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور اہل عراق نے حضرت علی کے بعد امام حسن کو منتخب کیا تھا۔ مگر جب امیر معاویہ نے ان پر لشکر کشی کی تو انھوں نے مصالحت کر لی۔ لہٰذا اہل عراق نے بھی امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی مگر مغلوب ہو کر۔ اس وجہ سے ان کی خلافت میں تغلب شامل تھا۔ چنانچہ حضرت سعد بن وقاص فاتح قادسیہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں جب امیر معاویہ کے پاس آئے تو ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہ ہنسے اور کہا کہ اگر تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا بگڑ جاتا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جس طریق سے تم نے خلافت حاصل کی ہے اگر مجھے ملتی تو میں کبھی اس کو قبول نہ کرتا۔

غرض اہل نظر اور ارباب تقویٰ خلافت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جو خلفاء راشدین کے عہد میں تھا۔ امیر معاویہ کا غلبہ اور تسلط سے اس کو حاصل کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تغلب رضامندی سے بدل گیا کیونکہ امیر معاویہ کی خلافت کی قابلیت میں کسی شخص کو اختلاف نہ تھا۔ لیکن انھوں نے خلیفہ کے انتخاب عام کے دستور ہی کو توڑ ڈالا۔ اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا جس کے بعد سے خلفاء بنی امیہ سلسلے وار اپنے ہی خاندان کے افراد میں سے جس کو چاہتے ولیعہد بناتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خلافت پر استبداد غالب رہا۔ اور ان کی حکومت خاندانی سلطنت ہو گئی۔

قہر و غلبہ بنی امیہ کے عہد میں قہر و غلبہ کی حکمرانی تھی۔ یہاں تک کہ عبد الملک نے جو ان کا سب سے مدبر خلیفہ تھا صاف صاف کہدیا کہ "تم لوگ کیونکر یہ خواہش رکھتے ہو کہ ہم شیخین کے طریقہ سے تمہارے اوپر حکومت کریں پہلے خود تو ویسے ہو جیسے اس زمانے کے لوگ تھے"۔ اس وجہ سے ان کے زمانے میں وہ مظالم ہونے لگے جو استبداد میں لازمی ہیں۔ لوگ سختی کے ساتھ دبائے جانے لگے۔ جس کسی طرف سے مخالفت ہوتی اس کا سر کٹوا کر مشتہر کیا جاتا کہ دوسرے لوگ

ڈرجائیں اور مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

خلفاء کے علاوہ ان کے بعض بعض عمّال نے بھی آزاد طبع اور حریت پسند مسلمانوں کو جنھوں نے خلافت راشدہ کا عہد دیکھا تھا نہایت سختی کے ساتھ محکوم اور رعایا بنانا شروع کیا۔ زیاد اور اس کے بیٹے کے مظالم مشہور ہیں۔ یہ صرف شبہ پر لوگوں کو گرفتار کرکے سخت سزائیں دیتے تھے۔ حجاج بن یوسف والی عراق جو بنی امیہ کا سب سے معتمد وزیر تھا اپنے ظلم و ستم میں خصوصیت کے ساتھ بدنام ہوا۔

چونکہ استبداد کی خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کی حکومت رعایا کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ حکمراں جماعت کے مقاصد کے لئے ہوتی ہے اس وجہ سے یہ خلفاء اپنے مخصوص اغراض کے لئے ملت میں وحدت بھی قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اسلامی تعلیم کے خلاف ان میں جاہلانہ قبائلی عصبیتوں کو ابھار کر ایک کو دوسرے کا دشمن رکھتے تھے تاکہ ضرورت پر ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلے میں کام لے سکیں۔

بیت المال

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خلفاء راشدین عام افراد ملت کی طرح بسر کرتے تھے۔ بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور اس میں سوائے اس کے جو ان کے گزارہ کے لئے مقرر کردیا جائے۔ اپنی ذات کے واسطے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے۔ اس پر بھی کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داریوں سے قیامت کے دن اگر ہم بلا عذاب اور ثواب کے نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہو لیکن خلفاء بنی امیہ شاہانہ شان و شوکت سے رہتے بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے اور جس طرح چاہتے اپنی منشاء کے مطابق صرف کرتے۔

ظاہر ہے کہ جس کا اقتدار خزانے پر ہوگا وہی ملک کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کرسکتا ہے۔ یہ خلفاء مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے استبدادی مقاصد میں صرف کرکے لوگوں کو اپنا تابعدار بناتے۔ کیونکہ جو لوگ ان کے یہاں سے وظائف پاتے ان میں

یہ جرأت باقی نہ رہتی کہ مخالفت کر سکیں۔ جو نافرمانی پر آمادہ ہوتا اس کا وظیفہ بند کر دیا جاتا چنانچہ یزید کے عہد میں اہل حرمین کے اور ولید کے زمانے میں آل حزم کے وظائف بند کئے گئے۔ انصار کے وظائف بارہا اس بنا پر روک دیے گئے کہ اہل بیت کی طرفداری کرتے ہیں۔

مدینے کا عامل زکوٰۃ کی رقم قریش کے سرداروں کو قرض دیا کرتا تھا جس کی وجہ سے ان پر قابو رکھتا تھا۔ جہاں ان سے کوئی مخالفانہ حرکت نمایاں ہوتی فوراً قرض کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی امیہ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

ہوسِ زر

خلافت راشدہ میں ممالک مفتوحہ سے محاصل اس لئے وصول کئے جاتے تھے کہ مجاہدین کی ضروریات رفع کی جائیں اور فقراء و مساکین کی احتیاج کا سد باب کیا جائے لیکن بنی امیہ کا نصب العین چونکہ اپنے گھرانے میں مستقل سلطنت قائم کرنا تھا اس لئے ان کو ضرورت ہوتی کہ طاقتور قبائل و اشخاص پر اپنا اثر رکھیں۔ اس کی صورت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ ان کو دولت سے اپنا طرفدار بنائیں۔ چنانچہ انھوں نے بیت المال کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور جا و بیجا بے دریغ اس کی رقمیں صرف کرنے لگے۔ امراء و رؤسائے قبائل کے علاوہ خطباء و شعراء کو بھی بڑی بڑی رقمیں زبان بندی اور اپنی مدح و ثنا کے لئے دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ محاصل کی وصولی میں ناجائز سختیاں عمل میں آنے لگیں یہاں تک کہ بعض صوبوں کے ذمیوں سے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ افریقہ اور خاص کر خراسان میں اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ محمد ہادی ہیں محصل نہیں ہیں اس خلاف اسلام طریقہ کو بند کیا۔ جس کے بعد انھوں نے ترک، خزر و سمرقند میں جو اسلام سے برگشتہ

ہو گئے تھے پھر مسلمان ہو گئے۔

الغرض شخصی اور استبدادی حکومت کی جو لازمی خرابیاں ہیں وہ خلافت بنی امیہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔ وہ اگرچہ مسلمانوں کا مرکز تھے لیکن ان کی مرکزیت خلفاء راشدین کی طرح اخوت۔ مساوات اور جمہوریت کی مرکزیت نہ تھی بلکہ انھوں نے ملت کو جو خلافت راشدہ میں صرف اللہ کی غلام تھی اپنا غلام بنا لیا تھا۔

بنی عباس

عباسیہ جنھوں نے مخفی تبلیغوں سے بنی امیہ کی بغاوت کا بیج بو دیا اور پھر ان کے مقابلے کے لئے لوگوں کو کھڑا کیا جب کامیاب ہو کر ۱۳۲ھ میں تخت خلافت پر آ گئے تو انھوں نے بھی وہی استبداد قائم رکھا جو بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ ان میں سے ابتدائی آٹھ خلفاء کا زمانہ جو تقریباً سو سال رہا قوت اور شوکت کا زمانہ تھا۔ انھوں نے شعائر اسلامی کا احترام رکھا۔ نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ حج بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی حصہ لیتے تھے مگر باوجود اس کے ملک ملت کو ہمیشہ کے لئے اپنا اور اپنی اولاد کا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ ایک کے بجائے دو دو تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے اور ان عہد ناموں پر اللہ اور رسول۔ ملائکہ بلکہ جنات تک کو گواہ بناتے تھے تاکہ یہ "جائداد" کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جا سکے اور ابد تک ساری ملت اسلامیہ انھیں کے استبداد کے شکنجہ میں رہے۔

خلفاء بنی امیہ کو تو جملہ امت کی مرکزیت سیاسی بھی حاصل تھی مگر بنی عباس کے قبضہ سے اندلس روز اول سے خارج رہا۔ جہاں بنی امیہ کے بقایا میں سے ایک شخص عبدالرحمن بن معاویہ نے پہنچ کر سلطنت قائم کر لی تھی جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد عظمت و شان کے لحاظ سے خلافت عباسیہ کی حریف ہو گئی۔ علاوہ بریں عہد بنی امیہ میں قوت کی حکمرانی تھی کیونکہ ان کی سلطنت اپنی قوم عربوں کی عصبیت اور طاقت پر قائم تھی مگر بنی عباس نے عجمیوں خاص کر خراسانیوں کی مدد سے سلطنت حاصل کی تھی۔ اس وجہ سے کوئی قومی

طاقت ان کے پاس نہ تھی۔ ان کی خلافت بجز اس کے کہ خلیفہ عرب تھا اور زبان عربی تھی سرتاسر عجمی تھی۔ اور ساری وزارتیں اور امارتیں عجمی موالیوں کے ہاتھوں میں تھیں یہی وجہ ہوئی کہ ان کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خلافت کو ہمارے ہاتھوں سے نکال کر دوسروں کو نہ دیدیں چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کے بالمقابل ترکوں کی بھی ایک فوج رکھی تاکہ توازن قائم رکھیں۔ مگر اس ترکی فوج نے خود خلفار پر تغلب حاصل کر لیا جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جس کو چاہتے تھے معزول بلکہ قتل کر دیتے تھے۔ خلفار کی اس بے بسی کے زمانے میں سارے انتظامات درہم برہم ہوگئے اور نئی نئی سلطنتیں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ جن کے غلبہ سے وہ بے دست و پا ہوگئے۔ دیالمہ اور سلاجقہ کے تسلط کے عہد میں جو صدیوں رہا ان خلفار کا صرف مذہبی اثر رہ گیا تھا اور حکومت سلاطین کے ہاتھوں میں تھی۔

خلافت کا مقصد یہ تھا کہ جملہ بنی نوع انسان صرف حکومت الٰہی کے فرمانبردار ہوں نہ کہ انسانوں کے۔ لیکن اموی اور عباسی خلفار نے اس کو محض خاندانی سلطنت بنانے کی کوشش کی جس کا انجام وہی ہوا جو ہر ایسے دنیاوی کاموں کا ہوا کرتا ہے۔ امرار ولایات نے جب خلفار کی یہ خود غرضی دیکھی تو ان میں بھی اسی قسم کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے گئے۔ خلفار کا صرف رسمًا اس قدر اثر رہ گیا تھا کہ یہ متغلبین تحفے اور ہدیے بھیج کر ان سے اپنی اپنی حکومتوں کی سند لکھوا لیتے۔ آخر ۶۵۶ھ میں یہ بے جان خلافت ہلاکو کے ہاتھوں غارت ہوگئی۔

خلفار عثمانیہ بغداد کی تباہی کے بعد سلاطین مصر نے انھیں بقایائے بنی عباس میں سے ایک شخص کو مصر میں خلیفہ بنا لیا تاکہ اس ذریعہ سے اپنی حکومت کو مستحکم رکھیں۔ ان خلفار کا عزل و نصب خود سلاطین مصر کے اختیار میں تھا جن کے وظیفہ پر یہ گزر کرتے تھے۔ سنہ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کر کے خلافت

بھی حاصل کر لی ۔ اور اس طرح اپنے دنیاوی وقار کے دستار میں دینی عزت کا بھی طرہ لگایا ۔ لیکن خلفاء عثمانیہ بالطبع اپنے رتبہ سلطنت ہی کو جس کے ذریعے سے انھوں نے خلافت حاصل کی تھی بالاتر سمجھتے رہے ۔ اور سوائے سلطان کے کبھی اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا پسند نہ کیا ۔ انھوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور جزیرۃ العرب کے محافظ ہونے کے جو فتح مصر کے بعد سے ان کی سلطنت کا جزو ہو گیا تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا ۔ یہاں تک کہ حج جس میں اقصائے عالم کے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اور جو اجتماع ملت کا دینی مرکز ہے اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے ۔ بالآخر ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے اس خلافت کا بھی جو اتحاد ملت کا ایک بوسیدہ رشتہ اور بے معنی ادارہ رہ گیا تھا الغا کر دیا جس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزی زندگی کا نام بھی جاتا رہا ۔

موجودہ حالت آج امت اسلامیہ کی تعداد تمام عالم میں تخمیناً ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوموں کی تعداد سے اگر زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں ہے ۔ مگر ان میں سے سوائے ترک ۔ ایرانی ۔ افغان اور عرب کے جن کی مجموعی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے بقیہ ساری امت غیر مسلم حکومتوں کے قبضہ میں ہے یعنی مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا زیادہ سے زیادہ صرف دسواں حصہ ہے جو آزاد کہا جا سکتا ہے ۔ ان آزاد اقوام مسلمہ کا بھی کوئی ایک مرکز نہیں ہے بلکہ متعدد خود مختار سلطنتوں میں بٹی ہوئی ہیں ۔ عرب جس سے اسلام کا چشمہ ابلا تھا آج اس میں چھوٹی بڑی ۹ ریاستیں ہیں ۔ یہ تشتت نتیجہ ہے امراء و سلاطین امت کی ان مطلق العنانیوں کا جن کی وجہ سے انھوں نے مرکزیت کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے ذاتی اغراض کے پیچھے ملت کے انجام پر نظر نہیں ڈالی ۔

جو قومیں غیروں کی محکوم ہیں ان کا انتشار تو اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ان کے اعمال سے صلاحیت مفقود ہو گئی ہے ۔ ادھر کم سے کم دو سو سال کے کارناموں پر

اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کوششوں اور قربانیوں کے بھی کامیابیوں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ مراقش سے لے کر دیوار چین تک کتنے ہنگامے اٹھے اور مجاہدانہ معرکے ہوئے۔ مگر ہر ایک میں نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اُمت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور کوئی مرکز نہیں ہے جو اس کی قیادت کرے۔

قرآن کا وعدہ حق ہے کہ عزت مومنوں کے لئے ہے۔

اِنّ العزۃ للہِ ولرسولہ وللمومنین ۶۳/۸	عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے۔

وکان حقاً علینا نصر المومنین ۴۷/۳۰	اور ہمارے اوپر حق ہے مومنوں کی مدد کا۔
ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ۱۳۹/۳	اور نہ سست ہو اور نہ غم کرو۔ اگر تم مومن ہو تو تمہیں سربلند رہو گے

قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہوگا۔

ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا ۱۴۱/۴	اور اللہ کافروں کو کبھی مسلمانوں کے اوپر راستہ نہ دیگا۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومن کفار پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔

ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لایجدون ولیاً ولا نصیرا ۲۲/۴۸	اور جو کفار تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر لیں گے اور وہ کوئی پشت پناہ اور مددگار نہیں پائیں گے۔

اور قرآن مومنوں کے لئے روئے زمین کی بادشاہت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض ۵۵/۲۴	تم میں سے جو لوگ ایمان لاتے اور عمل صالح کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ضرور روئے زمین میں بادشاہ بنائے گا۔

لیکن ان کے برخلاف صدیوں سے مسلمان مسلسل زوال اور انحطاط کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جو سرعت کے ساتھ ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔

وہ نہ صرف زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ ان کا بڑا حصّہ کفر و شرک سے مغلوب ہوکر محکومیت کے دردناک عذاب میں گرفتار ہے جس سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے ۔ اور ممکن نہ تھا کہ ہمارے مومن ہوتے ہوئے اللہ اپنے وعدے پورے نہ کرتا ۔ اس لئے ہم کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہمارا مومن اور صالح العمل ہونا اللہ کے نزدیک مسلّم نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم ان وعدوں کے مستحق نہ رہ سکے ۔

ذہنی تشتت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے صرف ایک کتاب لے کر آئے تھے یعنی قرآن کریم جس پر عمل کر کے صحابہ کرام نے دینی اور دنیاوی سربلندی حاصل کی۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا عمل اسی کتاب پر رکھا اور اُمّت کو اس سے ہٹنے نہ دیا جس کی وجہ سے ان کے زمانوں میں کوئی مذہبی تفریق پیدا نہ ہو سکی اور ساری امت متحد رہی ۔

عہد بنی امیہ میں جب استبداد کا تسلّط ہوا اس وقت خلفاء نے دنیا کو لے کر دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے حصہ میں آگئی ۔ اسی وقت سے اختلافات پڑنے لگے اور شخصیت پرستی کی وجہ سے نت نئے فرقے بننے شروع ہو گئے ۔ عبّاسی عہد میں فقہا میں اختلافات واقع ہوئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی ٹولیاں الگ الگ ہونے لگیں اسی زمانے میں علوم عقلیہ کے عربی میں ترجمے ہوئے ۔ اس وقت سے اختلافات روایات و تاویلات کے باعث یہ ذہنی تشتت اور بڑھ گیا ۔ چنانچہ ایک ہی ملت میں ۷۲ فرقے بن گئے جن میں سے ہر ایک اپنے ہی کو ناجی سمجھنے لگا اور دوسروں کو ناری ۔ اس طرح پر ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی ۔ اور ہر مسلمان صرف انفرادی حیثیت سے مسلمان رہ گیا نہ کہ اجتماعی ۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے امت کو دو عظیم الشان نعمتیں ملی تھیں ایک قرآن کریم۔ دوسری امامت کبرٰی یعنی مرکزیت امت جس کو آپ نے نصب فرمایا تھا۔ استبداد نے مرکزیت کو فنا کر دیا اور سیاسی لحاظ سے امت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے اور اشخاص پرستی نے قرآن کو متروک کر دیا۔ اور مذہبی لحاظ سے امت کے کئی فرقے بنا دئیے۔ جس سے دنیاوی اور دینی دونوں حیثیت سے اس میں لامرکزیت آگئی۔ اس لئے امت کی آئندہ صلاح وفلاح کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ لامرکزیت کو چھوڑ کر وحدت کی طرف آئے۔ یعنی رفتہ رفتہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہو جائے۔ جہاں سے ملت کے اجتماعی مقاصد کی تعیین اور ان کو عمل میں لانے کی تشکیل ہو اور دینی مرکز صرف قرآن ہو تاکہ ہر قسم کی فرقہ بندی مٹ جائے اور سب کے سب متحد ہو کر ایک راستے پر گامزن ہوں

خاتمہ

قرآن کریم میں ہر صاحب بصیرت غور کرنے سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اسلام مجموعی لحاظ سے اجتماعی دین ہے۔ یعنی وہ جملہ نوع بشر کی اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے۔ بیشک وہ انفرادی تعلیمات بھی پوری پوری اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ان تعلیمات سے وہ افراد کا تزکیہ باطن اور ان میں تقویٰ پیدا کرکے ان کو ملت کا جزو صالح بنانا چاہتا ہے تاکہ پوری ملت کی اجتماعی زندگی صالح العمل ہوجائے۔ یہ نظام اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کے خلاف جو نظام بھی قائم ہوگا وہ غیر اسلامی اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہ پانچ ارکان کی ادائگی پر قائم ہے جن سے انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ یعنی توحید۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ اور حج

یہ آخری رکن جو اسلام کے مرکزی مقام مکہ میں ادا کیا جاتا ہے امت کی اجتماعی خرابیوں کی اصلاح کے لئے ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم آج بھی اپنی بگڑی کو سنوار سکتے ہیں اگر خلوص دل سے کوشش کریں۔ اس لئے اس کی کیفیت کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں۔[1]

بیت اللہ توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوائے اعظم ہیں۔ انھوں نے بحکم الٰہی اس گھر کو اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے بنایا۔ اس وقت جب کہ دنیا میں کوئی دوسری مسجد نہ تھی۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وہدی للعالمین ۹۶/۳	پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور دنیا جہان کیلئے ہدایت

---

[1] حج کی حقیقت پر ہمارا مبسوط مقالہ طلوع اسلام دہلی دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوچکا ہے۔

جب یہ گھر بن گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ یہاں حج کے لئے آیا کریں۔

واذن فی الناس بالحج ۲۷/۲۲ | اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے

یہ اعلان کل انسانوں کے لئے کیا گیا جیسا کہ فی الناس کے لفظ سے ظاہر ہے۔ لیکن مراد یہاں بنی نوع انسان کے موحدین ہیں۔ کیونکہ اس گھر کی بنیاد ہی توحید پر ہے۔ اور قرآن نے اس میں غیر موحدوں کا داخلہ بند کر دیا ہے۔

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام ۲۸/۹ مشرک تو نجس ہیں۔ وہ مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکیں۔

یہاں ضمناً یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اسلام نے کہ روز اول سے وہی دین الہی ہے جملہ انسانوں کو ایکساں قرار دیا ہے اور نسل۔ رنگ۔ ملک یا زبان کے اختلاف سے ان میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ صرف ایک تفریق کو وہ ضروری قرار دیتا ہے۔ یعنی اسلام و کفر کی۔ جو لوگ عہد الست پر قائم ہیں اور انبیاء کے ذریعے سے ملی ہوئی صحیح تعلیم کے تابع۔ وہ حزب اللہ ہیں اور جو شرک یا کفر میں مبتلا ہیں حزب الشیطان ہیں۔ یہ تفریق بلا امتیاز قوم و نسل قائم رہی ہے اور قیامت بلکہ جنت اور دوزخ تک رہے گی۔

الغرض کعبہ کو اللہ نے موحدوں کا بین الاقوامی مرکز قرار دیا۔ اور خاتم النبیین کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے ملت اسلامیہ کا قبلۂ نماز بھی اسی کو بنایا۔

آج حضرت ابراہیم کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہو گئے حج کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ہر سال اس مرکز میں دنیا کے چاروں گوشوں سے موحد آکر جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے نہ صرف اس مکان کو بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی حیثیت کے لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے۔

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس والشھر الحرام ۹۷/۵ | اللہ نے کعبہ بیت الحرام کو انسانوں کے لئے دار و مدار قرار دیا نیز ماہ حرام کو۔

اس آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ کعبہ موحدوں کی بین الاقوامی انجمن کا مرکز ہے جہاں سے اجتماعی امور کی اصلاح عمل میں آئے گی۔ اور جس زمانے میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ یعنی ذی قعدہ۔ ذالحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم قرار دیا جس میں ہر قسم کے جھگڑے روک دیئے جائیں گے تاکہ لوگ امن کے ساتھ اس میں شریک ہوسکیں

اس اجتماع کی غرض بھی صرف ایک مختصر جملہ میں بیان کر دی۔

لیشہدوا منافع لہم ۲۸/۲۲ | تاکہ اپنے فائدے کے لئے حاضر ہوں۔

یہ فائدے کچھ اخروی ثواب ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ دینی۔ دنیاوی۔ ملکی اور ملی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں۔ اور یہی رکن ہے جس سے ملت کی ہر قسم کی خرابیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

یہی مرکزیت باعث ہوئی کہ قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان کیا۔

سواءن العاکف فیہ والباد ۲۵/۲۲ | اس میں باشندے اور باہر والے ایکساں ہیں۔

جس کی وجہ سے صحابہ کرام کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا اور وہاں کے کسی باشندے کا یہ حق نہیں تسلیم کیا کہ وہ کسی آفاقی اور باہر سے آنے والے حاجی کو اپنے گھر میں قیام سے روک سکے۔ بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانے کو بھی منع کرتے تھے۔ اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔

حج کی صحیح صورت یہ ہے کہ جس جس ملک یا قوم کے مسلمان مکہ میں آئیں پہلے سے اپنا اپنا ایک ایک امیر حج منتخب کریں۔ یہ امرار حج نہ صرف یہ کہ اپنے ملک یا اپنی قوم کے حاجیوں کے قیام و طعام کا مکہ میں بندوبست کریں بلکہ ان کے نمائندے اور ترجمان بھی ہوں۔ پھر یہ سب کے سب امرار مکہ میں باہم مل کر بیٹھیں۔ تبادلہ خیالات کریں تاکہ ہر اسلامی ملک اور قوم کی دینی اور دنیاوی حالت اجتماعی لحاظ سے ان کے سامنے

آجائے۔ انھیں امراء میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے مجمع عام میں ایک خطبہ دے جس میں ملت کی پوری اجتماعی حالت پر تبصرہ اور ان کی رہبری ہو اور ایک سال کا اجتماعی لائحہ عمل۔

عرفات سے پلٹ کر حجاج مقام منا میں آجاتے ہیں۔ یہاں تین دن ٹھہرتے ہیں۔ قربانیاں کرتے ہیں اور کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ یہاں بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔ ہر قوم کے افراد اپنی قربانی کی رقمیں اپنے امرار کو دیدیں۔ وہ ضرورت اور اندازے کے مطابق قربانیاں کریں۔ ایک جگہ پکوائے اور سب کو ایک ساتھ مل کر کھائیں۔ اقوام مسلمہ جن کا دماغی تعارف امرار کے ذریعے سے مکہ میں ہو چکا ہے یہاں ایک دوسرے کی میزبانی اور بھائی کرکے آپس میں تعارف پیدا کریں تاکہ باہمی الفت اور اخوت سے وحدت ملی کا احساس بڑھے۔

تشریق کے ان تین دنوں میں ہر جماعت کے امیر کو عرفات کا خطبہ اپنے ہمراہیوں کو اپنی زبان میں سمجھا دینا چاہیئے۔ اب جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے گا۔ وہ عرفات کے منبر کا پیغام ساتھ لائے گا۔ اس سے تمام عالم اسلامی میں اجتماعی روح بیدار ہو جائے گی۔

ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لئے نصب فرمایا ہے۔ ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہنچتی ہے۔ ان سب منبروں کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب بے نور، افسردہ اور منتشر ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف نصب مرکزیت ہے اور کچھ نہیں کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد خود بخود متوجہ ہو جاتا ہے جس سے ساری قوم منظم ہو جاتی ہے جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے

ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ امت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ ناکامی ہوگی اس لئے کہ یہ الٹا راستہ ہے۔

اس طرح پر ہم اپنے حج کے بین الاقوامی اجتماع سے کام لے کر ہر اسلامی خطہ کی آزادی کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انقلابات جو عجلت کے ساتھ اقوام و ملل پر آرہے ہیں ان میں ایسا وقت آجائے کہ مسلمان جن خطوں میں آباد ہیں ان میں آزاد جمہوریتیں قائم ہو جائیں۔ پھر ہماری یہی مکہ کی بین الاقوامی انجمن ملت کا مرکز بن جائے گی۔

اب میں اپنی ایک نظم پر جو عرصہ ہوا طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کو ختم کرتا ہوں۔

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملت — کہ جس کا کوئی نہ مرکز ہو اور نہ کوئی نظام
ہو گرچہ ریگ بیاباں کی طرح لاتعداد — ہوا کے جھونکوں میں اڑتی پھرے گی صبح و شام
اگر ہو نظم تو ملت ہے آہنی دیوار — کہ جس کے سامنے طوفاں کو بھی نہیں ہے قیام
یہ نظم کیا ہے فقط ایک نقطۂ مرکز — زبانِ شرع میں جس کو کہا گیا ہے امام
ہیں اجتماعی مقاصد اسی سے وابستہ — امام زندہ ہے ملت کی زندگی کا قوام

جہاں کی دوسری قوموں کا ہے نسب پہ مدار — مگر ہے ملتِ اسلام جامع الاقوام
اساس اس کی ہے یعنی "لا الہ الا اللہ" — اسی اساس پہ قائم ہوئی اخوت عام
نہ کوئی نسل، نہ کوئی زبان، نہ کوئی ملک — ہے امتیاز سیاہ و سفید و سرخ حرام
ہے اس کے ربط میں قوموں کا ارتباط تمام — ہے اس کے نظم میں دنیا کی امتوں کا نظام

یہ کیا غضب ہے کہ مسلم کو یہ نہیں معلوم — سپرد کی گئی اس کو امامتِ اقوام
امام ملتِ اسلام نائب حق ہے — تمام اہل جہاں جس کے حکم کے ہیں غلام

اگر ہے دین محمد کا پاس ملت کو
تو آج نصب امامت ہے اسکا پہلا کام

اسی قیس کی اپنی ایک دوسری نظم بھی شائع کرائی تھی۔ یہاں اس کو بھی درج کرتا ہوں۔

انفرادیت ہے اقوام و امم کے حق میں موت
اس کے سایہ سے بھی ہے اقبال کتراتا ہوا

آہ! وہ ملت کہ جو رکھتی نہیں زندہ امام
دمبدم دیکھے گا تو اس پہ زوال آتا ہوا

وہ سمجھتی ہے جسے جنت کی راہ مستقیم
راستہ جاتا ہے وہ دوزخ کو بل کھاتا ہوا

دین و دنیا کچھ نہیں ملتا ہے مرکز کے بغیر
بے سری ملت پہ ہے ادبار منڈلاتا ہوا

اجتماعیت کے اوپر ہے بنا اسلام کی
دیکھتا ہوں میں ادھر مسلم کو بھرا آتا ہوا

اس رواقِ نیلگوں میں مجھ کو آتا ہے نظر
اپنی ملت کا ستارہ نور برساتا ہوا

تصانیف مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

تاریخ الامت - ابتدا سے اسلام کی مکمل مستند مسلسل اور مربوط تاریخ جو نہایت تحقیق کے ساتھ سلیس اور صاف اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اور بوجہ اپنی خوبیوں کے قومی نصاب میں داخل اور ملک میں مقبول ہو چکی ہے۔

حصہ		قیمت
حصہ اول	سیرۃ الرسول	قیمت
" دوم	خلافت راشدہ	"
" سوم	خلافت بنی امیہ	"
" چہارم	خلافت عباسیہ	"
" پنجم (کلاں)	عباسیہ بغداد	"
" پنجم (خورد)	" "	"
" ششم	عباسیہ مصر	"
" ہفتم	آل عثمان	"
" ہشتم	تاریخ اسلام اور قرآن	"

تاریخ القرآن - قرآن مجید کے ابتدائے نزول سے آج تک کے تاریخی حالات اور مفید معلومات

سیرۃ عمرو بن عاص رض - نامور صحابی، فاتح مصر و طرابلس کے حالات اور مجاہدانہ کارنامے

حیات حافظ - خواجہ حافظ شیرازیؒ کی دلکش سوانح عمری ان کی شاعری پر بحث اور تاریخی خیالیں

حیات جامی - فارسی کے نامور شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے حالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ

الوراثۃ فی الاسلام - فن وراثت میں مولانا کا بے نظیر مجتہدانہ کارنامہ (بزبان عربی)

محجوب الارث - مسئلہ نہا کی ناقابل انکار دلائل سے تردید۔

مکتبہ جامعہ دہلی، نئی دہلی۔ لاہور، لکھنؤ، بمبئی